مونوگراف

کرشن چندر

نند کشور وکرم

مونوگراف

کرشن چندر

نند کشور وکرم

اردو اکادمی دہلی

سلسلۂ مطبوعات اردو اکادمی دہلی نمبر ۱۹۹

Monograph

Krishan Chander

By

Nand Kishor Vikram

Published by
URDU ACADEMY, DELHI

Print
2014
Rs.50/-

ضابطہ

سنِ اشاعت
۲۰۱۴ء

پچاس روپے

شوبی آفسیٹ، ۲۸۱۸، گلی گڑھیا، کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

اردو اکادمی، دہلی، سی۔ پی۔ او۔ بلڈنگ، کشمیری گیٹ، دہلی۔ ۱۱۰۰۰۶

ISBN: 81-7121-223-9

ترتیب

HaSnain Sialvi

کہانیاں:

کرشن چندر کا فن

حرفِ آغاز

دلّی ہمیشہ ہندوستان کے دل کی دھڑکنوں کا محور و مرکز رہی ہے۔ اسی لیے ''عالم میں انتخاب'' اس شہر بے نظیر کی تاریخ و تہذیب، علم و فن اور زبان و ادب کو پورے ملک کی نمائندگی کا شرف حاصل ہے۔ آزاد ہندوستان کی یہ تاریخی راجدھانی بجا طور پر اردو زبان و ادب کی راجدھانی بھی کہی جاسکتی ہے۔ اسی کے گرد و نواح میں کھڑی بولی کے بطن سے زبانِ دہلوی یا اردو نے جنم لیا جو اپنی دھرتی کی سیاسی، سماجی، تہذیبی اور معاشرتی ضرورتوں کے زیرِ سایہ نشو و نما پا کر اس عظیم تہذیب کی ترجمان بن گئی جسے ہم گنگا جمنی تہذیب کا نام دیتے ہیں اور جو ہماری زندہ و تابندہ تاریخی وراثت ہے۔

دلّی کے ساتھ اردو زبان اور اردو ثقافت کے اسی قدیم اور اٹوٹ رشتے کے پیشِ نظر ۱۹۸۱ء میں اردو اکادمی، دہلی کا قیام عمل میں آیا اور ایک چھوٹے سے دفتر سے اکادمی نے اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ آج اردو اکادمی، دہلی کا شمار اردو کے فعّال ترین اداروں میں ہوتا ہے۔ اردو زبان و ادب اور اردو ثقافت کو فروغ دینے کے لیے اکادمی مسلسل جو کوششیں کر رہی ہے، انھیں نہ صرف دہلی بلکہ پورے ملک نیز بیرونی ممالک کے اردو حلقوں میں بھی کافی سراہا گیا ہے۔

اکادمی کے دستور العمل کی رو سے دہلی کے لیفٹننٹ گورنر پہلے اکادمی کے چیئرمین ہوتے تھے، دہلی میں منتخب حکومت کے قیام کے بعد اکادمی کے چیئرمین دہلی کے وزیر اعلیٰ ہوگئے ہیں جو دو سال کے لیے اکادمی کے اراکین کو نامزد کرتے ہیں۔ اراکین کا انتخاب دہلی کے ممتاز ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور اساتذہ میں سے کیا جاتا ہے جن کے مشوروں کی روشنی میں چیئرمین کی منظوری سے اکادمی مختلف کاموں کے منصوبے بناتی اور انھیں روبہ عمل لاتی ہے۔ اکادمی اپنی

سرگرمیوں میں دہلی اور بیرونِ دہلی کے دیگر اردو اداروں سے بھی باہمی مشورت اور تعاون قائم رکھتی ہے۔

اردو اکادمی، دہلی اپنی جن گونا گوں سرگرمیوں کی وجہ سے پورے ملک میں اپنی واضح پہچان قائم کرچکی ہے، ان میں ایک اہم سرگرمی اکادمی کی طرف سے ایک معیاری ادبی رسالے ماہنامہ ''ایوانِ اردو'' اور ''بچوں کا ماہنامہ امنگ'' کی اشاعت کے ساتھ ساتھ اعلیٰ معیار کی علمی اور ادبی کتابوں کی اشاعت بھی ہے۔

زیرنظر مونوگراف اس سلسلے کی ایک کڑی ہے جس میں اردو اکادمی نے ادبِ عالیہ کے حوالے سے ادبا و شعرا وغیرہ کے مختصر حالاتِ زندگی اور ان کی منتخب تحریروں کو شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ نئی نسل ہمارے مشاہیر کی حیات اور کارناموں سے واقف ہوسکے۔ کرشن چندر کی سوانح، شخصیت اور فکروفن پر مبنی یہ مونوگراف ان کے صد سالہ یومِ پیدائش پر بطور خراجِ عقیدت شائع کیا جارہا ہے۔ مونوگراف کی تالیف کے لیے ہم نے بزرگ ادیب اور فکشن نگار جناب نند کشور وکرم کی خدمات حاصل کی ہیں۔ موصوف اپنی کبرسنی کے باوجود ادب کے میدان میں اپنے رسالے ''عالمی اردو ادب'' کے ذریعہ جو کارہائے نمایاں انجام دے رہے ہیں وہ نہ صرف قابلِ تعریف ہیں بلکہ ریسرچ اسکالرز کے لیے کسی نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہیں۔ آپ کے رسالے کا ہر نمبر ایک دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ جناب نند کشور وکرم نے جس محنت، لگن اور دلجمعی کے ساتھ یہ مونوگراف تیار کیا ہے یہ انہی کا خاصہ ہے۔ ہم دست بدعا ہیں کہ موصوف صحت وتندرستی کے ساتھ زندہ سلامت رہیں تاکہ اردو ادب کے ذخیرے میں بیش بہا اضافہ ہوتا رہے۔

ہم اردو اکادمی دہلی کے چیئرمین کے ممنون ہیں جن کی سرپرستی اکادمی کی کارکردگی میں معاون ہوتی ہے۔ اکادمی کے دیگر ممبران کے سرگرم تعاون اور مفید مشورے ہمارے لیے رہنمائی کا کام کرتے ہیں جس کا اعتراف ضروری ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ زیرِ نظر کتاب وقت کی ایک اہم ضرورت پوری کرنے کے ساتھ ساتھ عام قارئین کی دلچسپی کا باعث بھی ہوگی۔

انیس اعظمی

سکریٹری

کرشن چندر
زندگی کے اہم واقعات

پیدائش:

عظیم افسانہ نگار کرشن چندر کی تاریخ ولادت اور جائے پیدائش کے بارے میں بہت اختلافات پائے جاتے ہیں۔ خود کرشن چندر نے سہیل عظیم آبادی کی فرمائش پر جو کوائف ۳ر دسمبر ۱۹۵۳ء کو ایک خط میں لکھ کر بھیجے تھے، اُس میں انھوں نے لکھا تھا کہ "میری پیدائش ۱۹ر نومبر ۱۹۱۳ء ہے" جبکہ مالک رام صاحب نے تذکرۂ ماہ و سال کے صفحہ ۳۱۵ پر اُن کی تاریخِ پیدائش ۲۳ر نومبر ۱۹۱۴ء بمقام وزیر آباد، پنجاب تحریر کی ہے۔ یہی تاریخ پیدائش اور جائے ولادت معروف افسانہ نگار جیلانی بانو نے بھی کرشن چندر مونوگراف مطبوعہ ساہتیہ اکادمی میں درج کی ہے۔ اس کے برعکس مشہور افسانہ نگار بلونت سنگھ کو دیے گئے انٹرویو میں کرشن چندر نے اپنا سن ولادت ۱۹۱۴ء اور جائے پیدائش لاہور بتائی تھی جو کہ کسی لحاظ سے بھی درست نہیں۔ جہاں تک جائے پیدائش کا سوال ہے اس کے بارے میں اُن کے چھوٹے بھائی مہندر ناتھ نے اُن سے متعلق اپنے مضمون 'کرشن چندر' میں اُن کی ولادت وزیر آباد کے بجائے ریاست بھرت پور تحریر کی ہے اور فن اور شخصیت بمبئی کے کوائف نمبر کے صفحہ ۳۰۸ پر بھی اُن کی آمد بھرت پور راجستھان درج ہے۔ جو کہ صحیح معلوم ہوتی ہے، جبکہ مالک رام کی طرح جگدیش چندر ودھاون کا خیال ہے کہ وہ پنجاب کے مشہور شہر وزیر آباد میں پیدا ہوئے مگر میرا خیال ہے کہ مہندر ناتھ کی تحریر کردہ جائے

پیدائش درست معلوم ہوتی ہے کیونکہ اُن کے والد ڈاکٹر گوری شنکر چوپڑا اُن دنوں ریاست بھرت پور میں ملازم تھے۔ ان تمام تاریخوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اُن کی ولادت ۲۳ نومبر ۱۹۱۴ بمقام بھرت پور کچھ حد تک صحیح معلوم ہوتی ہے۔ اور اب اسی کو صحیح مانا جاتا ہے۔

کرشن چندر کے علاوہ گوری شنکر جی کے تین بیٹے...... مہندر ناتھ (۲۲ نومبر ۱۹۱۷ء بھرت پور۔ ۲۰ / مارچ ۱۹۷۴ء ممبئی، وفات بعارضہٗ قلب)، بھوشن (چھ سال کی عمر میں وفات) اور اوپیندر ناتھ عرف 'اومی' (۱۰ / نومبر ۱۹۲۶ء۔ وفات ۲۱ / فروری ۲۰۱۴ء، روہنی دہلی) تھے اور ایک بیٹی سرلا دیوی (۱۹۲۳ء وفات ۸ / مئی ۱۹۷۵ء دہلی) تھی جو کہ اُردو کی معروف افسانہ نگار تھیں، اور جن کی ایک اسکوٹر ایکسیڈنٹ میں وفات ہوگئی تھی۔

گوری شنکر پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر تھے اور انھوں نے اپنی ملازمت کی شروعات ریاست بھرت پور میں بحیثیت میڈیکل افسر کی تھی مگر وہاں انگریز ریزیڈنٹ اُن سے کسی بات پر ناراض ہوگیا جس کی وجہ سے انھیں ملازمت چھوڑنی پڑی۔ پھر کچھ دیر ادھر اُدھر ہاتھ پیر مارنے پر انھیں کشمیر کی ریاست پونچھ میں ملازمت مل گئی اور اُن کی اہلیہ شریمتی پرمیشوری دیوی (وفات ۲۵ / جنوری ۱۹۶۹ء) بھی جو اُن دنوں اپنے جیٹھ لالہ جگت نارائن بانی مدیر ہند سماچار جالندھر کے ہاں لاہور کے محلہ چوک متی میں قیام پذیر تھیں، وہاں سے اپنے بچوں کرشن اور مہندر کو لے کر براستہ راولپنڈی پونچھ روانہ ہوگئیں۔ جہاں ان لوگوں نے زندگی کا طویل عرصہ گزارا اور چوں کہ ریاست پونچھ چار تحصیلوں پونچھ، پلندری، باگھ اور مہنڈر پر مشتمل تھی لہٰذا اُن کا تبادلہ اکثر ایک تحصیل سے دوسری تحصیل میں ہوتا رہا تھا۔ مہنڈر میں اُن کا تبادلہ دو بار ہوا تھا۔ پہلی بار جب کرشن چندر لڑکپن میں تھے اور دوسری بار جب وہ شباب کی دہلیز پر قدم رکھ چکے تھے۔

کرشن چندر اور اُن کے بہن بھائی والد کو 'باؤ جی' اور والدہ کو 'ماں جی' کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے۔ کرشن چندر کے والدین خیالات میں ایک دوسرے کے متضاد تھے اور ان میں نظریاتی جنگ یا بحث ومباحثہ چلتا رہتا تھا۔ والد آریہ سماجی تھے اور ذات پات اور چھوت چھات کے سخت مخالف تھے اور اوہام پرستی اور دیوی دیوتاؤں کی پوجا کے سخت مخالف تھے۔ وہ گاندھی جی کے پیروکار تھے مگر اس کے باوجود وہ گوشت خور بھی تھے اور مے نوش بھی لیکن انھیں گھر میں یہ سب کچھ کرنے کی اجازت نہ تھی لہٰذا جب اُن کے دوست تھانیدار نیاز احمد دورے سے واپس آتے تو اسپتال کے اسپیشل وارڈ میں جو عام طور پر خالی رہتا تھا، اُن کی خوب محفل جمتی، دونوں مل کر مرغ

مسالہ بھونتے اور پھر شراب و کباب کی محفل جمتی اور رات گئے تک خوش گپیاں اور قہقہوں کی آوازیں سنائی دیتی رہتیں۔ وہ زندہ دل، ایماندار اور عاشق مزاج انسان تھے۔ انھوں نے کبھی رشوت نہ لی۔ بس ایک بار اُن سے ایک لغزش ہوگئی تھی جس کے لیے وہ زندگی بھر نادم و شرمندہ رہے۔ اس غلطی کا اقبال انھوں نے کرشن چندر کی والدہ سے کیا تھا اور انھیں بتایا تھا کہ علاقے کے دو دولتمند بھائیوں ٹھاکر چین سنگھ اور ٹھاکر نین سنگھ میں ایک کھیت کے سلسلے میں جھگڑا ہوگیا تھا جس پر دونوں زخمی ہوکر اُن کے اسپتال میں داخل ہوئے۔ ٹھاکر چین سنگھ کو شدید چوٹیں لگی تھیں مگر انھوں نے نین سنگھ سے دو ہزار روپے رشوت لے کر ڈاکٹری رپورٹ میں خفیف چوٹیں لکھ دیا تھا تاکہ دونوں بھائیوں میں آسانی سے صلح صفائی ہوجائے۔

گوری شنکر ایک عاشق مزاج شخص تھے اور اُن کی عاشق مزاجی کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے پونچھ میں قیام کے دوران کئی معاشقے کیے جن کا ذکر کرشن چندر نے ''میری یادوں کے چنار'' میں بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ وہ چھوت چھات اور ذات پات کے خلاف تھے اور انسانیت پر وشواس رکھتے تھے اور اپنے بچوں کو بھی اسی عقیدے پر کاربند رہنے کی تلقین کرتے تھے لیکن والدہ کٹر مذہب پرست اور اوہام پرست خاتون تھیں۔ مندر جانے کے علاوہ گردوارے بھی جاتی تھیں اور صرف جپ جی صاحب کا پاٹھ ہی نہیں کرتی تھیں بلکہ مزاروں پر نذر و نیاز بھی چڑھایا کرتی تھیں۔ مذہب کے لحاظ سے وہ کٹر سناتن دھرمی تھیں اور چھوت چھات میں وشواس رکھتی تھیں۔ پورن ماشی کے روز خصوصاً بچوں کو ہدایت تھی کہ وہ نوکروں سے نہ چھوئیں اور نوکروں کو بھی سخت حکم تھا کہ وہ بچوں سے دُور دُور رہیں۔

پورن ماشی کے دن وہ گھر کے سارے فرش پاک صاف کرتیں اور معمول سے زیادہ پوجا پاٹھ کرتیں اور کرشن چندر کی طویل عمری اور صحت مندی کے لیے پنڈت جی سے ہون اور پوجا پاٹھ کراتیں۔ اُس دن وہ کرشن چندر کو نہلا دھلا کر نئی صاف ستھری کوری دھوتی پہننے کو دیتیں اور جنیؤ پہنا کر ایک پاک صاف آسن پر بٹھا کر گائیتری منتر کا جاپ کرنے کی تلقین کرتیں۔ پھر وہ اپنے پروہت مشرا جی کی آمد پر اُن سے پوجا پاٹھ کراتیں بعدازاں وہ کرشن چندر کے وزن کے برابر انھیں سات اناجوں کا آمیزہ ''ست ناجا'' دان کرتیں نیز ایک کوری دھوتی اور دو روپے دکشنا دے کر انھیں وداع کرتیں اور پنڈت جی سارا مال سمیٹ کر اور آشیرباد دیتے ہوئے رخصت ہوجاتے۔

کرشن چندر کے والد اُن کی اس پوجا پاٹھ اور دان پُن کا مذاق اُڑاتے اور مشرا جی کو فراڈ کہا کرتے۔

پورن ماشی کے دن وہ بچوں کو چھوٹی ذات کے لوگوں سے دور رہنے کی ہدایت بھی دیتیں اور اُس دن گھر کے کسی نوکر کی ہمت نہ تھی کہ وہ ماں جی کے حکم کے خلاف کرشن چندر کو چھو سکے۔ اُس دن انھیں مولو چمار کی بیٹی سے بھی نہیں کھیلنے دیا جاتا تھا جو کرشن کی گہری دوست تھی اور روزانہ اُن کے ساتھ کھیلا کرتی تھی۔ کرشن جی کی والدہ کو وہ ایک آنکھ نہ بھاتی تھی اور وہ بنا کسی بات کے بھی اسے ڈانٹتی رہتی تھیں جس کا درحقیقت منشا یہ تھا کہ وہ اُن کے بیٹے کے ساتھ نہ کھیلے۔ اس کے برخلاف کرشن چندر کے والد اسے بے حد پیار کرتے تھے اور اسے کبھی یہ احساس نہیں ہونے دیتے تھے کہ وہ کسی نیچ ذات سے تعلق رکھتی ہے۔

اسکول میں تعلیم :

لگ بھگ پانچ برس کی عمر میں وہ مہنڈر کے پرائمری اسکول میں داخل ہوئے۔ پانچویں جماعت سے انھوں نے اُردو پڑھنی شروع کی مگر بڑی مشکل سے پڑھی اور اکثر اس مضمون میں پٹتے رہے۔ لہٰذا اُردو کو مشکل جان کر چھٹی جماعت میں انھوں نے سنسکرت لے لی لیکن اُس میں بھی وہ نہ چل سکے اور سنسکرت کے اُستاد سے بھی پٹتے رہے اس لیے جب وہ آٹھویں جماعت میں پہنچے تو انھوں نے سنسکرت کے بجائے فارسی کا مضمون لے لیا جو ماسٹر بلاقی رام نندہ پڑھاتے تھے جو گلزاری لال نندہ سابق مرکزی وزیر حکومت ہند کے والد تھے جو دوبار عارضی طور پر ہندوستان کے وزیر اعظم بھی رہے تھے۔ بلاقی رام ہر مضمون پڑھانے میں بڑی مہارت رکھتے تھے اور وہ انگریزی، ریاضی، فارسی، اُردو تاریخ اور جغرافیہ پڑھانے میں بڑے مشاق تھے۔ وہ بھی اُن کی خوب پٹائی کرتے تھے۔ ایک تو اس لیے کہ انھیں فارسی نہیں آتی تھی دوسرے اس لیے کہ ڈاکٹر گوری شنکر نے اُن سے شکایت کی تھی کہ کرشن چندر اخبار پڑھتے ہیں جو اُن کے نزدیک اچھی عادت نہیں تھی۔

کرشن چندر ماسٹر بلاقی رام نندہ کی مار کبھی نہیں بھولے اور جب وہ ادیب بن گئے تو اسکول کے زمانے میں انھوں نے اُن پر ایک طنزیہ مضمون بھی لکھا تھا جس کا عنوان تھا ''مسٹر بلیکی'' جس میں ان کا مذاق اُڑایا گیا تھا۔ یہ مضمون انھوں نے دہلی کے مشہور اخبار ریاست میں چھپنے کے لیے بھیج دیا جس کے مدیر دیوان سنگھ مفتونؔ تھے اور جن کی شہرت پورے ہندوستان میں پھیلی ہوئی

تھی۔ مفتون صاحب نے مذکورہ مضمون جوں کا توں شائع کر دیا جس پر کرشن چندر کو بڑی حیرت ہوئی کیونکہ اس میں انھوں نے اپنے اُستاد کے خلاف کئی گستاخیاں کی تھیں۔ جیسا کہ کرشن چندر نے لکھا ہے کہ: مضمون بہت مقبول ہوا اور وکٹوریہ ہائی اسکول کے عملہ کے تمام ارکان نے اسے مزے لے لے کر پڑھا۔ مضمون کی اس قدر شہرت ہوئی کہ سارے علاقے میں غلغلہ مچ گیا۔ جب کرشن چندر کے والد ماجد کو اس کی خبر ملی تو انھوں نے اُن کی اس حرکت پر اُن کی اچھی خاصی ڈانٹ ڈپٹ کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس کے بعد کرشن چندر نے کئی سال تک کوئی مضمون لکھنے کی جسارت نہ کی۔

کرشن چندر نے بعد ازاں اپنی یادداشت میں اپنے اسکول کے دو اور اساتذہ ماسٹر کالو رام اور ماسٹر دینا ناتھ کا ذکر بھی کیا ہے۔ اول الذکر براہمن ذات کے تھے مگر شریف ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے سخت گیر تھے۔ وہ شاعری میں بڑی مہارت رکھتے تھے اور اشعار کی تشریح و توضیح کرنے میں بھی اُن کا جواب نہیں تھا۔ ماسٹر دینا ناتھ ایک کشمیری براہمن تھے اور شوق تخلص کرتے تھے اور علاقے کے ایک مقبول شاعر ہونے کی وجہ سے اُن کی بڑی شہرت تھی۔ اُن کی زباندانی، سخن شناسی اور شعری مہارت کے بھی ہر سو چرچے ہوتے تھے۔ وہ سالانہ انعامات کی تقریب میں، راجہ کے جنم دن پر اور دربار خاص کے موقع پر راجہ کی شان میں قصیدہ پڑھتے اور انعام و اکرام سے فیض یاب کیے جاتے۔ اس کے علاوہ کسی کی شادی پر سہرا لکھنے میں بھی وہ پیش پیش رہتے تھے۔

اُردو کے عام طلبا کی طرح کرشن چندر کے دل میں بھی شعر و شاعری کا شوق پیدا ہو گیا اور ایک دن جب ماسٹر دینا ناتھ اپنے کمرے میں اکیلے بیٹھے تھے، انھوں نے اپنے اشعار اصلاح و داد کے لیے ان کی خدمت میں بڑی عاجزی اور انکساری سے پیش کیے۔ اُن کا خیال تھا کہ ماسٹر جی انھیں داد دیں گے مگر انھوں نے داد دینے یا حوصلہ افزائی کرنے کے بجائے ان کے دونوں گالوں پر تھپڑ رسید کر دیے اور پھر کلاس میں بھی جا کر طلبا کے سامنے اُن کے اشعار کا مذاق اُڑایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے اندر موجزن شعری سوتا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سوکھ گیا اور اس کے بعد انھوں نے اس جانب کبھی توجہ نہ دی اور افسانہ نگاری کی طرف راغب ہو گئے۔

اسکول کے زمانے میں شرارتیں کرنے میں بھی وہ پیچھے نہیں تھے اور کبھی کبھار اپنے اساتذہ کا بھی مذاق اُڑانے سے نہیں چوکتے تھے۔ ماسٹر بلاتی رام کا خاکہ اُڑانے کے علاوہ انھوں نے اپنے پی ٹی کے ماسٹر کو بھی نہیں بخشا تھا جن کی عادت تھی کہ ڈرل کراتے وقت اکثر اونگھنے لگتے تھے۔ ایک

دن تو حد ہوگئی وہ بچوں کو 'لیفٹ فارورڈ' کہنے کے بعد اونگھنے لگے اور بیچارے بچے صف بستہ ہاتھ آگے بڑھائے اور ایک پاؤں اُوپر اُٹھائے اُن کے اگلے حکم کا انتظار کرتے رہ گئے حتیٰ کہ اُن کی ہمت جواب دے گئی۔ بقول کشن جی: اسی طرح ایک بار وہ کلاس میں اونگھ رہے تھے تو اُن کے چھوٹے قد، لال چہرے اور سر پر اُٹھے ہوئے بال دیکھ کر انھیں گلیوں میں گھومنے والا مرغا یاد آ گیا اور انھوں نے بڑے زور سے آواز لگائی ''ککڑوں کوں''۔ یہ آواز سُن کر ماسٹر جی چونک کر جاگ اُٹھے اور غصے سے گرجنے لگے کہ یہ ککڑوں کوں کس نے کی تھی۔ اس کا جواب تو نہ ملا۔ ہاں ساری کلاس ہنس پڑی اور اس دن کے بعد پی ٹی ماسٹر اسکول میں ''مرغا ماسٹر'' کے نام سے مشہور ہو گئے۔

بچپن:

بچپن میں کرشن جی اور مہندر ساتھ ساتھ ہی رہے۔ پونچھ میں بھی، لاہور میں بھی اور بمبئی میں بھی۔ دونوں میں بے حد پیار تھا اور بچپن میں ایک ہی تھالی میں کھانا کھاتے تھے اور ایک ہی چارپائی پر سوتے تھے اور سبھی پروگرام اکٹھے ہی مرتب کرتے تھے مگر کرشن جی کو پتنگ بازی سے بالکل لگاؤ نہ تھا جبکہ مہندر پتنگ بازی کے بڑے شوقین تھے۔ اُن کی چھوٹی بہن سرلا دیوی نے اس بارے میں اُن سے متعلق ایک سوانحی مضمون میں لکھا ہے کہ:

> ''ایک بار پتنگ اُڑاتے اُڑاتے مہندر جی کا ڈور سے انگوٹھا کٹ گیا۔ بس کرشن جی کو اپنا غصہ اُتارنے کا موقع مل گیا۔ انھوں نے مہندر ناتھ کو مارا۔ مہندر جی بھی مار پیٹ نہ سہہ سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں گتھم گتھا ہو گئے اور بعد ازاں ایک دوسرے پر فرنیچر اُٹھا اُٹھا کر پھینکنے لگے لیکن جلد ہی لڑائی ختم ہو گئی اور دونوں بھائی گلے مل گئے۔ جب غصہ ٹھنڈا ہوا تو کرشن جی نے وعدہ کیا کہ آج کے بعد وہ مہندر کو کبھی نہیں ماریں گے اور مہندر ناتھ نے بھی وعدہ کیا کہ آئندہ وہ پتنگ نہیں اُڑائیں گے۔''(۱)

کرشن چندر کو ڈرامے دیکھنے کا بھی بڑا شوق تھا اور وہ گھر سے جھوٹ بول کر بھی تھیٹر میں ڈراما دیکھنے چلے جایا کرتے تھے۔ پہلی بار پونچھ میں انھوں نے اپنے والد کے ساتھ ڈراما ''خون ناحق'' دیکھا جو شیکسپیئر کے ''ہیملٹ'' پر مبنی تھا اور جس میں ڈرامے کا ہیرو ہیملٹ سینہ پیٹ پیٹ کر اور چیخ چیخ کر اپنی محبوبہ 'اوفلیا' سے اظہارِ عشق کرتا تھا مگر کرشن چندر اتنے کمسن تھے کہ انھیں عشق کا

مطلب سمجھ میں نہ آیا اور واپسی پر انھوں نے والد سے عشق کے معنی پوچھے جس کا وہ انھیں تسلی بخش جواب نہ دے سکے اور تنگ آ کر جواب دیا کہ جب تم بڑے ہو جاؤ گے تو تم خود ہی سمجھ جاؤ گے کہ عشق کیا ہوتا ہے لیکن کرشن چندر تو اسی وقت ہی سمجھنا چاہتے تھے لہٰذا تسلی بخش جوب نہ پا کر وہ روتے بسورتے گھر پہنچے تو والدہ نے پوچھا کہ وہ کیوں رو رہے ہیں؟ اس پر ان کے والد نے کہا عشق کے معنی پوچھ رہا تھا۔ یہ سنتے ہی اُن کی والدہ نے اپنے سر پر زور سے ہاتھ مارا اور کہا کہ اسی لیے تو منع کرتی تھی کہ بچے کو تھیٹر مت لے جاؤ۔ اس پر کرشن جی نے چیخ چیخ کر اعلان کر دیا کہ ماں میں بھی عشق کروں گا جیسے وہ تھیٹر میں کرتا تھا۔ اس پر اُن کی والدہ کو غصہ آ گیا اور انھوں نے دو ہنٹر پیٹتے ہوئے کہا "ہاں بیٹا تو کیوں نہیں عشق کرے گا تو عشق بھی کرے گا اور خاندان کا نام بھی ڈبوئے گا۔ ابھی سے تیرے لچھن کہے دیتے ہیں"۔

اسی طرح کرشن چندر کے بھائی مہندر ناتھ نے بھی اُن سے متعلق مضمون میں لکھا ہے کہ "کھیل کود کے علاوہ انھیں ڈراموں میں کام کرنے کا بڑا شوق تھا۔ ایک بار تو انھوں نے مہابھارت کے ڈرامے میں ارجن کا پارٹ کافی خوبصورتی سے ادا کیا۔ پونچھ میں اُن دنوں کوئی سنیما گھر نہ تھا۔ کبھی کبھار لیلا رچائی جاتی تھی یا باہر سے گویے آتے تھے اور ماسٹر رحمت علی کی ڈراما کمپنی مختلف ڈرامے کھیلا کرتی تھی۔ کرشن چندر نے شاید ہی کوئی ڈراما نہ دیکھا ہو۔ اکثر وہ بہانہ بنا کر چلے جاتے کہ فلاں کے گھر پڑھنے جا رہا ہوں لیکن جاتے تھے وہ ڈراما دیکھنے۔" (۲)

کرشن چندر نے اپنے بچپن کا ایک دلچسپ واقعہ "مٹی کے صنم" میں درج کیا ہے جو راجاؤں کے رعب داب اور پُر شکوہ زندگی پر روشنی ڈالتا ہے۔ ان کے مطابق:

> "ایک بار پونچھ کے راجہ بلدیو سخت علیل ہوئے۔ انھوں نے کرشن چندر کے والد کو بلوا بھیجا۔ شاہی محل جاتے ہوئے وہ کرشن چندر کو بھی ہمراہ لے گئے۔ وہاں پہنچ کر کرشن چندر کے والد راجہ صاحب کو دیکھنے محل کے اندر چلے گئے اور کرشن چندر محل کے کسی حصے میں کھیلنے لگے۔ کھیل میں اُن کے ساتھ دو راجکمار اور ایک شاہی باورچی کا بیٹا شامل تھے۔ شاہی باورچی کے بیٹے نے بڑے عمدہ رنگ برنگ کے پتھر دکھائے جو اُس نے دریا کے کنارے سے چنے تھے۔ راجکمار کے چچازاد بھائی نے بالکل نئے قسم کے بنٹے (ماربل) دکھائے جو اُس نے سری نگر سے منگوائے تھے۔ راجکمار نے خود انھیں ایک جیبی گھڑی

دکھائی جو گیت گاتی تھی۔ گھڑی دیکھ کر وہ سب حیران رہ گئے۔ اب کرشن چندر سے انھوں نے کہا اُن کے پاس جو کچھ ہے وہ بھی دکھائیں۔ کرشن چندر نے اپنے آبائی شہر وزیر آباد میں بنا ہوا تین پھل والا چاقو جس کے پھل باری باری ایک اسپرنگ دبانے سے کھلتے تھے اور جس کی سفید ہتھی ہاتھی دانت کی بنی ہوئی تھی، دکھائی۔ یہ چاقو کرشن چندر کو اُن کے والد صاحب نے دیوالی کے تہوار پر بطور تحفہ دیا تھا اور ان کو بیش از جان عزیز تھا۔ چاقو دیکھ کر وہ سب مبہوت ہو گئے۔ راجکمار نے کرشن چندر کے ہاتھ سے چاقو چھین کر اپنی جیب میں ڈال لیا اور کہا۔ 'اسے ہم رکھیں گے'' دوسرا راجکمار پہلے راجکمار سے جھگڑنے لگا کہ چاقو وہ لے گا۔ کرشن چندر چاقو ہاتھ سے جاتا دیکھ کر دونوں راجکماروں سے اُلجھ پڑے اور انھوں نے اُس راجکمار کو جس نے چاقو اُن سے چھینا تھا کس کر چانٹا رسید کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سب لڑکے مل کر کرشن چندر پر پل پڑے اور انھوں نے مار مار کر اُن کا بھرکس نکال دیا اور کپڑے بھی پھاڑ ڈالے۔ کرشن چندر رونے لگے۔ رونے کی آواز سُن کر والد صاحب اندر سے نکل آئے۔ جب انھوں نے سارا واقعہ سنا تو انھوں نے غصے میں کرشن چندر کو پیٹ دیا کہ انھوں نے راجکمار پر ہاتھ کیوں اُٹھایا؟''۔ (۳)

اور یہ واقعہ اُن کے دل و دماغ پر ایسا ثبت ہوا کہ وہ زندگی بھر نہ بھول پائے جیسے وہ چاقو اُن کے دل میں کھب گیا تھا اور اس چبھن نے انھیں جاگیرداروں اور راجواڑوں کے خلاف غصہ کی آگ بھڑکا دی اور بعد ازاں جب وہ افسانہ نگار بن گئے تو انھوں نے اُن جاگیرداروں اور راجاؤں کے خلاف اپنی کئی کہانیوں میں غصہ نکالا۔ بقول اُن کے:

''یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ یہ لوگ اسی طرح کرتے ہیں۔ سفید ہتھی والا چاقو، کوئی حسین لڑکی، زرخیز زمین کا ٹکڑا، سب اسی طرح ہتھیا لیتے ہیں، پھر واپس نہیں کرتے۔ اسی طرح تو جاگیرداری چلتی ہے مگر اچھا نہیں کیا اُن لوگوں نے۔ دو آنے کے چاقو کے لیے مجھے اپنا دشمن بنا لیا۔ وہ سفید چاقو آج تک میرے دل میں کھبا ہوا ہے۔ اس طرح میں نے جو کچھ لکھا ہے اسی سفید چاقو کو پانے کے لیے لکھا ہے۔'' (۴)

کرشن چندر کے والد نے ریاستی سرکار کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد کوئی دو سال پونچھ کے ایک میڈیکل اسٹور میں ملازمت کی اور پھر اپنی نجی دکان ''مہندرا میڈیکل ہال'' کے نام سے شروع کی لیکن یہ سلسلہ زیادہ دیر نہ چلا اور وہ گھر والوں کے اصرار پر سارا کام سمیٹ کر دہلی آگئے۔ پروسٹیٹ گلینڈ انلارجمنٹ کی بیماری انھیں پونچھ میں ہی تھی۔ یہاں آکر دمہ بھی ہوگیا۔ طبیعت بگڑ گئی اور انھیں پروسٹیٹ گلینڈ انلارجمنٹ کے آپریشن کے لیے اروِن اسپتال (لوک نائک اسپتال دہلی) میں داخل کرایا گیا مگر آپریشن میں کچھ پیچیدگیاں پیدا ہوگئیں جس سے اُن کی وفات ہوگئی۔

اعلیٰ تعلیم:

کرشن چندر میٹرک کے بعد لاہور کے فارمن کرسچین کالج میں داخل ہوئے لیکن ایف اے کے امتحان میں دو نمبر سے ناکام ہوگئے۔ لہٰذا شرم سے لاہور سے بھاگ کر کلکتہ چلے گئے لیکن جانے سے پہلے ہاتھ میں جو سونے کی انگوٹھی تھی، اُسے اُتار کر کمرے میں رکھ گئے۔ جب اُن کے والدین کو خبر ملی تو وہ بے چین اور پریشان ہو اُٹھے، خصوصاً اُن کی والدہ پر تو اس کا اتنا اثر ہوا کہ پاگل سی ہوگئیں اور انھیں تن بدن کا ہوش نہ رہا اور وہ فوراً اُن کی تلاش میں لاہور پہنچیں اور وہاں انھوں نے لاہور کا چپہ چپہ چھان مارا مگر وہ لاہور میں ہوتے تو انھیں ملتے۔ بعد ازاں جب کرشن جی کو خبر ملی کہ اُن کی والدہ بیمار ہیں تو وہ واپس لاہور آگئے۔ اُن کے لوٹنے پر والدہ کو بے حد مسرت و اطمینان ہوا اور انھوں نے کرشن جی کو تلقین کی کہ وہ کہانیاں لکھنی چھوڑ ایم اے پاس کریں اور وکالت کر کے خاندان کا نام روشن کریں۔ کہا جاتا ہے کہ کرشن جی نے تحریری طور پر وعدہ کیا کہ وہ ایم اے پاس کریں گے اور وکیل بنیں گے لیکن نہ تو وہ جج بنیں گے اور نہ افسانے لکھنا بند کریں گے۔

مجاہدِ آزادی:

کالج کے زمانے میں کرشن چندر کے دل میں جذبۂ آزادی موجزن ہوگیا اور جلسے جلوسوں میں حصہ لینے لگے۔ جب ہندوستان میں سائمن کمیشن آیا تو جگہ جگہ اُن کے احتجاجی جلوس نکالے گئے۔ ایسے ہی جب سائمن کمیشن لاہور پہنچا تو لالہ لاجپت رائے کی سرکردگی میں کمیشن کے

خلاف زبردست جلوس نکالا گیا۔ لاہور کے ہزاروں نوجوانوں کی طرح کرشن چندر بھی اس جلوس میں شامل ہوئے جو ریلوے اسٹیشن پر کمیشن کا انتظار کر رہے تھے۔ کرشن چندر عین لالہ لاجپت رائے کی پچھلی صف میں کھڑے تھے اور زور زور سے ''کمیشن گو بیک'' کے نعرے لگا رہے تھے۔ جب کمیشن اسٹیشن سے باہر نکلنے لگا تو مظاہرین نے ان کا راستہ روک لیا۔ جب انتہائی کوشش کے باوجود مظاہرین ٹس سے مس نہ ہوئے تب پولیس سارجنٹ سانڈرس نے لاٹھی چارج کا حکم دیا اور مظاہرے میں شریک لوگوں پر تڑا تڑ لاٹھیاں برسانی شروع کر دیں جس کے نتیجہ میں لالہ لاجپت رائے پولیس کی لاٹھیوں سے زخمی ہو گئے جس سے اُن کا انتقال ہو گیا۔

کرشن چندر کو بھی کندھے پر لاٹھی کا وار سہنا پڑا جس کے بعد وہ پیچھے کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے اور موری گیٹ کے باغ میں ایک بنچ پر بیٹھ کر آرام کی سانس لی لیکن اس واقعہ کے بعد وہ جلوسوں میں شریک ضرور ہوتے رہے مگر وہ اگلی صف کے بجائے پچھلی صف میں کھڑے ہوتے تھے تاکہ اگر لاٹھی وغیرہ چلے تو اپنا بچاؤ کر سکیں اور ضرورت پڑنے پر آسانی سے بھاگ جائیں۔

جب وہ انٹرمیڈیٹ میں تھے تو اُن کی ملاقات بھگت سنگھ کے ساتھیوں سے ہوئی جن کے زیرِ اثر وہ بھی انقلابی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے۔ وہ کالج سے بھاگ کر بھگت سنگھ کی انقلابی پارٹی میں شامل ہو گئے اور پھر جب وہ گھر واپس آئے تو انھیں گرفتار کر لیا گیا اور انھیں لاہور کے قلعہ میں نظر بند کر دیا گیا۔ وہ لگ بھگ دو ماہ تک نظر بند رہے مگر اُن کے خلاف ثبوت نہ ملنے پر انھیں نظر بندی سے نجات مل گئی۔

ایل ایل بی کے زمانے میں وہ سوشلسٹ پارٹی کے رکن بن گئے اور پارٹی نے اُن کی کارکردگی کو دیکھتے ہوئے بھنگیوں کی یونین کا صدر بنا دیا اور وہ ان کی بستیوں میں جا کر میٹنگیں کرتے، اُن کے مسائل کو سنتے اور انھیں حل کرنے کی کوشش کرتے مگر یہ سیاسی سرگرمیوں کا دور جلد ختم ہو گیا کہ انھیں احساس ہو گیا تھا کہ سیاست اُن کے بس کی بات نہیں اور سیاسی لیڈر کی صلاحیتوں کا اُن میں فقدان ہے۔

بعد ازاں انھوں نے اپنے اشتراکی خیالات و نظریات کے اظہار و تشہیر کے لیے ادب کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا اور بہت سی کہانیاں لکھیں جن میں انھوں نے اپنے نظریات کا بڑے فنکارانہ انداز سے اظہار کیا۔ ان کے کئی افسانے جیسے تین غنڈے، بالکونی، مہالکشمی کا پُل، دو فرلانگ لمبی

سڑک، موبی، آسمان روشن ہے...... اور اُن کا رپورتاژ '' جب کھیت جاگے'' وغیرہ ان کے ایسے ہی خیالات کی عکاسی کرتے ہیں۔

ادبی رجحان:

کرشن چندر کو بچپن میں ہی کتابیں پڑھنے کا چسکا لگ گیا تھا۔ اور جب وہ تیسری جماعت میں تھے تو انھوں نے سب سے پہلے جو ادبی کتاب پڑھی وہ الف لیلہ کا اُردو ترجمہ تھا۔ ان ہی دنوں وہ اپنے دوست دیانند کپور کی دوکان سے کتب ورسائل لا کر پڑھا کرتے تھے۔ اسی دوکان سے وہ رسالہ 'مستانہ جوگی' اور 'مانسرور' بھی لا کر پڑھا کرتے تھے۔ مؤخرالذکر رسالہ انھیں اس لیے پسند تھا کہ اُس کے مدیر کا نام بھی گوری شنکر تھا۔ کتابوں کی اسی دوکان پر اکثر ادباو شعرا اکٹھے ہوتے تھے اور وہاں اکثر ادبی بحث و مباحثہ بھی ہوتا رہتا تھا۔ کرشن چندر بھی اکثر ان ادبی مذاکروں کے دوران وہاں موجود رہتے تھے اور اسی دوکان پر اُن کی پہلی بار معروف ادیب، شاعر اور صحافی مرحوم چراغ حسن حسرتؔ سے ملاقات ہوئی تھی۔

کرشن چندر کے والد کے ایک قریبی دوست سید مظفر حسین شاہ جو کہ دیوان مالگزاری میں تھے وہ اور اُن کا بیٹا حسن شاہ بھی کتابوں کے بڑے شوقین تھے اور اُن کے گھر میں اُن کی ذاتی لائبریری تھی جس میں دو ہزار کے قریب کتابیں تھیں اور وہاں حسن شاہ نے کرشن چندر کو کھلی چھوٹ دے رکھی تھی کہ وہ جو کتاب بھی چاہیں لے جائیں لہٰذا اس لائبریری سے بھی وہ کتابیں لا کر پڑھا کرتے تھے۔

کرشن چندر کے والد کو ادبی کتابیں اور رسائل پڑھنے پر کوئی اعتراض نہیں تھا مگر اُن کی والدہ کو اُن کا کتابیں پڑھنا ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ تاہم الف لیلہ پڑھنے سے اُن میں کہانیاں پڑھنے میں دلچسپی پیدا ہوئی لہٰذا اس کے بعد انھوں نے سدرشن کی کہانیاں پڑھنی شروع کیں جو پریم چند کے ہم عصر ہی نہیں اُن کی طرح اُس دور میں بطور کہانی نویس بہت مشہور تھے۔ سدرشن کے بعد انھوں نے پریم چند کی کہانیاں پڑھیں۔ بقول اُن کے:

> '' میٹرک تک میں نے سارا اُردو ادب کھنگال ڈالا۔ میٹرک میں ٹیگور انگریزی میں پڑھا۔ اس کا اثر بہت دیر تک دل و دماغ پر رہا۔ انقلاب روس سے پہلے کے بڑے بڑے روسی ادیبوں نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ پشکن،

گوگول، میری مونٹوف، آندریف، تورگونیف، چیخوف، ٹالسٹائی، استراوسکی، گورکی تک روسی ادب اتنا اچھا اور عمدہ ہے کہ دوسری زبان میں اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ پرانے ادیبوں میں جن لوگوں کو بار بار پڑھ سکتا ہوں اور پڑھتا ہوں وہ شیکسپیئر اور غالب ہیں۔ غالب کے متعلق میرا خیال ہے کہ نہ صرف اُردو نے بلکہ ہندوستان کی کسی دوسری زبان نے بھی ۱۸۵۷ء کے بعد اتنا بڑا شاعر پیدا نہیں کیا لیکن یورپ کا مزاج انھیں کبھی پسند نہیں کرسکتا۔ موجودہ یورپی ناول نگاروں میں شولوف، ارنسٹ ہمنگ وے اور ہاورڈ فاسٹ مجھے بہت پسند ہیں۔'' (۵)

کرشن چندر نے کالج کے زمانے میں اپنے اسکول کے اُستاد بلاقی رام کا خاکہ لکھا تھا جو ہفتہ وار ریاست میں شائع ہوا تھا۔ لاہور آنے کے بعد انھوں نے باقاعدگی سے لکھنا شروع کیا۔ وہ کالج کے زمانے میں فارمن کرسچین کالج کے میگزین کے شعبۂ انگریزی کے ایڈیٹر بھی رہے۔ اور جب وہ ایل ایل بی میں زیرِ تعلیم تھے تو انھوں نے سنت سنگھ سیکھوں کے اشتراک سے ایک رسالہ ''دی ناردرن ریویو'' نکالا تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے فریدہ بیدی (معروف فلم اداکار کبیر بیدی کی والدہ) کے ساتھ ایک انگریزی ماہنامہ ''دی ماڈرن گرل'' کی ادارت کی۔ ان دنوں اُن کے انگریزی مضامین بھی انگریزی روزنامہ ''دی ٹریبون'' میں اشاعت پذیر ہوتے رہے۔ اسی اخبار میں علامہ اقبال کی وفات پر اُن کا ایک مضمون منظرِ عام پر آیا تھا جس میں علامہ کی چند نظموں کے تراجم بھی پیش کیے تھے مگر بعد ازاں وہ صرف اُردو زبان کے لیے ہی وقف ہوکر رہ گئے اور کبھی کبھار انگریزی میں لکھا کرتے تھے۔

اُن دنوں اُردو میں کئی معروف و مقبول رسالے لاہور سے شائع ہوا کرتے تھے اور کرشن چندر لگ بھگ سبھی رسائل میں لکھا کرتے تھے اور جلد ہی وہ اُردو کے نامور افسانہ نگاروں میں شمار ہونے لگے اور اُن کے کئی مجموعے ''طلسمِ خیال''، ''نظارے'' اور ''نغمے کی موت'' وغیرہ بھی منظرِ عام پر آئے جن کو ادبی حلقوں میں بے حد پسند کیا گیا۔

اُن کا اولین افسانوی مجموعہ ''طلسمِ خیال'' ۱۹۳۹ء میں مکتبہ اُردو سے شائع ہوا جس کی ہر طرف سے بڑی تعریف و توصیف ہوئی، اس کا دیباچہ اُس دور کے ممتاز افسانہ نگار سید فیاض محمود نے لکھا تھا جس کا اختتام انھوں نے ان الفاظ میں کیا تھا۔ ''کرشن چندر صاحب ایک نوجوان

افسانہ نگار ہیں۔ اُن کی تحریر میں، تخیل میں، قوتِ تخلیق میں رعنائی اور تازگی موجود ہے۔ اُن کی نظر ہر جگہ اور اُن کا دماغ زندگی کے ہر پہلو تک پہنچتا ہے۔ وہ ایک دلچسپ شخصیت رکھتے ہیں اور کامیاب افسانہ نگار ہیں۔''

لیکن جب جنوری ۱۹۴۳ء میں اُن کا پہلا ناول ''شکست'' منظرِ عام پر آیا تو اُس دور کے نامور ترقی پسند نقاد ڈاکٹر محمد دین تاثیر نے ماہنامہ ''ادبی دنیا'' میں اس کی تنقید کرتے ہوئے یہاں تک لکھ دیا کہ ''وہ طفلِ مکتب ہیں اور یہ کہ انھیں ناول نویسی سے توبہ کر لینی چاہیے تاکہ ان کی عاقبت خراب نہ ہو۔'' معلوم نہیں ڈاکٹر تاثیر نے ایسا تبصرہ کیوں کیا تھا جبکہ ماہنامہ 'ادبی دنیا' کے مدیر مولانا صلاح الدین اور ''ہمایوں'' کے مدیر میاں بشیر احمد اس ناول کی تعریف کر چکے تھے۔ اس تنقیدی رویے سے وہ اتنے مایوس اور دل برداشتہ ہو گئے اور اُن کے دل میں ناامیدی نے ایسا گھر کیا کہ وہ لکھنے لکھانے سے توبہ کر کے وکالت کرنے کی سوچنے لگے لیکن اس موقع پر اُن کے دوست اور مشہور مزاح نگار کنہیا لال کپور نے اُن کا حوصلہ بڑھایا اور انھیں اپنا ادبی سفر جاری رکھنے کی تلقین کی اور یہ بھی کہا کہ مستقبل قریب میں وہ بہت بڑے افسانہ نگار بن جائیں گے اور اُن کی شہرت چہار دانگِ عالم میں پھیل جائے گی اور ان کے تراجم دوسری زبانوں میں بھی ہوں گے۔ کنہیا لال کپور نے کرشن چندر کو یقین دلایا کہ وہ طفلِ مکتب نہیں بلکہ اچھے مشاق افسانہ نگار ہیں۔ انھوں نے کرشن چندر سے کہا:

> ''فی الحال میں تمھیں بتانا چاہتا ہوں کہ وہ وقت قریب آ رہا ہے جب تم بین الاقوامی شہرت کے مالک ہو گے۔ جب تمھارے افسانوں کے ترجمے انگریزی، روسی، فرانسیسی اور چینی زبانوں میں کیے جائیں گے۔ جب تمھارا نام اُن قد آور افسانہ نگاروں کے ساتھ لیا جائے گا جن پر ادبِ عالیہ کو ناز ہے۔''
>
> ''تم سچ کہہ رہے ہو۔ مجھے بنا تو نہیں رہے''
>
> ''بالکل سچ کہہ رہا ہوں''
>
> ''میری قسم کھاؤ''
>
> ''تمھاری قسم''
>
> اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی لہر اُبھری۔ آنکھوں میں ایک عجیب مسرت کی چمک پیدا ہوئی، اُس نے مجھے بغل گیر کرتے ہوئے کہا۔ میری کشمکش ختم ہوئی۔

میں چاند اور ستاروں کی موجودگی میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں لکھوں گا۔
برابر لکھوں گا۔ میرے لیے صرف تمھاری سند ہی کافی ہے کہ میں ادیب
ہوں۔ نقاد جائیں بھاڑ میں۔" (۶)

اور اس کے بعد انھوں نے کبھی کسی نقاد کی پروا نہ کی اور نہ کبھی کسی تنقید یا نکتہ چینی پر پریشان و مایوس ہوئے اور مسلسل اپنے فنی جوہر کا مظاہرہ کرتے رہے یہاں تک کہ انھیں ایشیا کا سب سے بڑا افسانہ نگار کہا جانے لگا۔

کرشن چندر کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ "نظارے" جون ۱۹۴۰ء میں اشاعت پذیر ہوا جو بارہ افسانوں پر مشتمل تھا اور جو "کتب خانہ ادبی دنیا لاہور" نے شائع کیا تھا اور جس پر مولانا صلاح الدین نے ۲۷ صفحات کا دیباچہ تحریر کیا تھا اور اس میں اُن کے مشاہدے، تجربے، سماجی اور معاشی مسائل، دلکش منظر نگاری، مسحور کن طرزِ تحریر کی بے حد تعریف کی تھی۔

کرشن چندر شروع ہی سے ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہو گئے تھے اور انھوں نے پہلی بار ۱۹۳۸ء میں کلکتہ میں منعقد کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس میں صوبہ پنجاب کی انجمن کے نمائندے کی حیثیت سے شرکت کی تھی اور پھر انجمن سے اُن کا رشتہ تا حیات قائم رہا۔ اسی کانفرنس کے دوران سجاد ظہیر اور پروفیسر احمد علی وغیرہ سے ان کا تعارف ہوا اور انھیں انجمن ترقی پسند مصنفین صوبہ پنجاب کا سکریٹری منتخب کیا گیا۔ بعد ازاں وہ دہلی اور بمبئی میں بھی اس کے سکریٹری منتخب ہوئے۔

لڑکپن کے شوق:

کرشن چندر کو لڑکپن میں کتب بینی کے علاوہ اور بھی کئی شوق تھے جن میں کرکٹ اور تھیٹر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ کرکٹ کھیلنے کا اتنا شوق تھا کہ وہ ایک اچھے بلے باز بن گئے تھے اور وہ اتنے اندھا دھند ہٹ لگاتے تھے کہ انھیں "بلائنڈ ہٹر" کہا جاتا تھا۔ اُن کے اسکول وکٹوریہ جوبلی ہائی اسکول اور مسلم ہائی اسکول پونچھ کے درمیان اکثر مقابلے ہوتے رہتے تھے جس میں کرشن کی بطور بلے بازی اچھی کارکردگی ہوتی تھی اور اُن کے چھوٹے بھائی مہندر ناتھ "فاسٹ باؤلر" کی حیثیت سے بڑی شہرت رکھتے تھے۔

دوسری دلچسپی اُن کی تھیٹر میں تھی۔ جب وہ نویں جماعت کے طالب علم تھے تو انھیں ڈرامے

میں دیکھنے کا بے حد شوق ہو گیا اور ان دنوں وہ شہر میں منعقد بھی ڈرامے دیکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ انھوں نے خود بھی کئی ڈراموں میں کام کیا تھا۔ ان ہی دنوں جب وہاں مہابھارت کا ناٹک کھیلا گیا تو اُس میں انھوں نے ارجن کا رول کیا تھا۔

کرکٹ اور ڈراموں کے علاوہ اُن کے اور بھی کئی وقتی شوق رہے تھے جیسے موسیقی، مصوری، فٹ بال اور گھوڑ سواری۔ مصوری کے شوق کا تو یہ عالم تھا کہ ساتویں آٹھویں جماعت میں انھوں نے کوئی دس بارہ تصویریں بنائیں مگر داد اور حوصلہ افزائی نہ ملنے پر انھوں نے جلد ہی اس شوق سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔

کتب بینی، کھیل کود اور سیر و تفریح کرتے ہوئے کرشن جی کا اسکول کا زمانہ ختم ہو گیا اور ۱۹۲۹ء میں پندرہ سال کی عمر میں انھوں نے میٹرک کا امتحان سیکنڈ کلاس میں پاس کر لیا اور پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے وہ لاہور چلے گئے جو اُس دور میں تعلیم و ثقافت کا بہت بڑا مرکز تھا اور جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ جس نے لاہور نہیں دیکھا، وہ پیدا ہی نہیں ہوا لیکن لاہور جانے کے بعد بھی وہ پونچھ کو نہیں بھولے اور گرمیوں کی تعطیلات ہوتے ہی وہ وہاں آجاتے تھے اور مہندر کے ساتھ پہاڑوں اور جنگلوں میں گھومتے اور قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہوتے۔ وہ جہاں بھی رہے پونچھ کی مسرت بخش یادیں ان کے ساتھ رہیں اور وہ کبھی بھی انھیں اپنے دل و دماغ سے الگ نہ کر سکے اور اس کے عکس اُن کی اکثر کہانیوں میں پائے جاتے ہیں۔

لاہور میں قیام:

میٹرک کرنے کے بعد مزید تعلیم کے لیے لاہور آگئے جو ان دنوں ہندوستان میں ادب و ثقافت کے ایک اہم مرکز کی حیثیت سے جانا جاتا تھا۔ یہاں وہ ۱۹۲۹ء سے ۱۹۴۰ء تک قیام پذیر رہے اور یہیں سے انھوں نے انگریزی میں ایم اے اور پھر ایل ایل بی کیا۔ یہاں پہلے پہل انھوں نے انٹرمیڈیٹ کے فارمن کرسچین کالج میں ایف ایس سی (میڈیکل) میں داخلہ لیا کیونکہ انھیں اُن کے والد اپنی طرح ڈاکٹر بنانے کے خواہشمند تھے مگر ان کی سائنس میں ذرا بھی دلچسپی نہ تھی لہٰذا انھوں نے جوں توں کر کے ۱۹۳۱ء میں ایف ایس سی پاس کر لیا مگر بی اے میں انھوں نے سائنس کو الوداع کہہ دیا اور اپنے فطری رجحان کے مضامین معاشیات، سیاسیات اور ادب اختیار کیے اور ۱۹۳۳ء میں انھوں نے گریجویشن مکمل کر لی۔ اس کے بعد ۱۹۳۵ء میں انھوں نے

انگریزی ادب میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی اور ۱۹۳۷ء میں انھوں نے لا کالج سے ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کر کے اپنی والدہ سے کیا وعدہ پورا کر دیا۔

لاہور میں کرشن چندر اپنے تایا لالہ جگت نارائن کے مکان پر بھائی چوک متی میں کچھ مدت مقیم رہے۔ جو اُس دور میں وہاں کے مشہور کانگریسی رہنما تھے اور جو بھائی پر مانند کے ہندی اخبار کی ادارت کرتے تھے اور جنھوں نے بٹوارے کے بعد ۱۹۴۸ء میں جالندھر سے روزنامہ ''ہند سماچار'' نکالنا شروع کیا جو آزادی کے بعد ہندوستان کا سب سے زیادہ چھپنے والا اُردو اخبار بن گیا تھا اور جس کی سرکولیشن ایک لاکھ سے تجاوز کر گئی تھی۔ شروع شروع میں کرشن چندر اُن ہی کے ہاں قیام پذیر رہے۔ بعد ازاں جب وہ ایل ایل بی میں زیرِ تعلیم تھے تو انھوں نے مہندر ناتھ کے ساتھ ہندو ہوسٹل میں رہائش اختیار کر لی جو کہ شہر کا بہت ہی گندہ اور خستہ حال ہوسٹل تھا اور جسے وہاں کے ساکن جیل سے مشابہ سمجھتے تھے۔ یہیں قیام کے دوران اُن کی ملاقات پروفیسر کنہیا لال کپور اور اپندر ناتھ اشک سے ہوئی اور اول الذکر سے ایسی دوستی استوار ہوئی کہ دونوں اپنا بہت سا وقت ایک ساتھ گزارتے تھے۔ یہ دوستی تا حیات قائم رہی۔

کرشن چندر نے والدہ کی خواہش کے مطابق ایل ایل بی تو کر لیا لیکن وکالت سے اُن کی رتی بھر بھی دلچسپی نہ تھی اور انھوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ کسی حالت میں بھی وکالت نہیں کریں گے۔ اس لیے وہ تلاشِ معاش میں سرگرداں رہنے لگے، انہی دنوں کنہیا لال کپور نے انھیں اپنے ناشر کے ہاں ڈیڑھ سو روپے ماہوار پر پروف ریڈنگ کا کام دلا دیا مگر وہ ہر روز کی دس گھنٹے کی مغز پچی اور ذہنی مشقت کے بعد ڈیڑھ سو روپے مہینہ انھیں کام پسند نہ آیا اور جلد ہی اس ملازمت سے اوب کر انھوں نے اسے چھوڑ دیا۔ پھر انھوں نے سوچا کیوں نہ علامہ اقبال پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کر لی جائے۔ اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے وہ کنہیا لال کپور کو لے کر علامہ اقبال کے پاس پہنچے مگر علامہ کو ان کی تجویز پسند نہیں آئی اور اس معاملے میں انھوں نے ان کی حوصلہ شکنی کی۔ علامہ کا کہنا تھا کہ ریسرچ تو اس پر کی جاتی ہے جو موجود نہ ہو اور جسے تلاش کیا جائے مگر میں تو زندہ موجود ہوں اور کسی زندہ شخص پر تھیسس لکھنے کی ہم اجازت نہیں دیتے۔ لہٰذا علامہ کے جواب سے مایوس ہو کر وہ واپس آ گئے لیکن ایک طرح سے یہ اچھا ہی ہوا ورنہ وہ ساری زندگی کسی یونیورسٹی میں اُستاد بن کر رہ جاتے اور ''ماہر اقبالیات'' کی حیثیت سیمیناروں اور ادبی محفلوں میں اُن کے بارے میں مقالے پڑھنے میں ہی زندگی صرف کر دیتے اور اُردو ادب ایک عظیم المرتبت فکشن نگار کے افسانوں اور ناولوں سے

محروم ہو کے رہ جاتا۔

آل انڈیا ریڈیو سے وابستگی:

پطرس جو کہ ایک بڑے ادیب ہونے کے علاوہ آل انڈیا ریڈیو کے ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل بھی تھے، انھی کی بدولت کرشن چندر کو ۱۹۳۹ء میں آل انڈیا ریڈیو لاہور میں 'پروگرام اسسٹنٹ' کی پوسٹ کی پیشکش ہوئی لیکن آفر پا کر انھیں زیادہ خوشی نہ ہوئی بلکہ وہ تذبذب میں پڑ گئے کہ ملازمت جوائن کریں یا نہ کریں، کیونکہ فطری طور پر وہ آزاد خیال اور برطانوی سامراج کی غلامی کے حق میں نہ تھے۔ وہ ایک ایسے قوم پرست تھے جو غلام ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد دیکھنا چاہتے تھے اور ہندوستان کے دوسرے قوم پرستوں کی طرح برطانوی سرکار کی حکومت کی ملازمت کے سخت خلاف تھے مگر معاشی حالت خستہ تھی اور کوئی ذریعۂ معاش نہیں تھا لہٰذا کئی دنوں کی ذہنی تذبذب کے بعد مجبوراً انھوں نے اس ملازمت کو قبول کر لیا مگر اُن کے دل میں ایک کھٹک سی رہی اور اُن کا ضمیر انھیں ملامت کرتا رہا۔ اس کا اُن کے دل و دماغ پر اتنا اثر تھا کہ جب جون ۱۹۴۰ء میں اُن کا پہلا افسانوی مجموعہ "نظارے" منظرِ عام پر آیا تو انھوں نے اس کے انتساب میں اپنی دلی کیفیت کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

> "اُس کرشن چندر کی یاد میں جس نے گزشتہ نومبر کی ایک کثیف اور اُداس شام کو
> خود اُن کے ہاتھوں گلا گھونٹ کر ہمیشہ کے لیے موت کے گھاٹ اُتار دیا۔"

انھوں نے کوئی تین سال تک آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت کی اور اس دوران وہ لاہور دہلی اور لکھنؤ میں مامور رہے اور جوں توں کر کے اپنا وقت کاٹتے رہے اور جوں ہی انھیں موقع ملا وہ اس قفس نما ملازمت کی تیلیاں توڑ کر ایک آزاد پرندے کی طرح فضاؤں میں پرواز بھرنے لگے۔

لاہور میں کوئی ایک سال تک ریڈیو میں کام کرتے رہے پھر اُن کا تبادلہ دہلی کر دیا جہاں وہ بھار گو لین تیس ہزاری میں قیام پذیر ہوئے اور یہ مکان ایک مدت اُن کے قبضے میں رہا اور جب بھی لکھنؤ، پونہ، بمبئی سے دہلی آتے تو یہیں قیام کرتے جہاں اُن کا پریوار رہتا تھا۔ یہیں انھیں ملنے کے لیے ہندوستان بھر کے شاعر اور ادیب آیا کرتے تھے، جن میں فیض احمد فیض، ڈاکٹر محمد دین تاثیر، ن۔م راشد، ہنس راج رہبر، جگن ناتھ آزاد، سعادت حسن منٹو، ریوتی سرن شرما ایسی ہستیاں شامل تھیں۔ یہیں آخر الذکر کی شادی کرشن جی کی بہن سرلا دیوی سے ہوئی تھی اور یہیں اُن کے

بھائی اپیندر ناتھ کی شادی کملا دیوی سے ہوئی تھی اور یہیں دہلی میں اُن کے والد گوری شنکر اور اُن کی والدہ پرمیشوری دیوی نے زندگی کی آخری سانسیں لی تھیں۔ اس مکان میں اُن کے بھائی اپیندر ناتھ اپنے پریوار کے ساتھ نومبر ۱۹۹۰ء تک قیام پذیر رہے اور پھر اسے ترک کر کے دہلی کی ایک دُور دراز کالونی روہنی میں اپنے فلیٹ میں شفٹ ہو گئے۔

آل انڈیا ریڈیو میں کرشن چندر کا تقرر ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل اے ایس بخاری (پطرس) کی سفارش پر ہوا تھا مگر دہلی آنے سے پہلے اُن کی اُن سے کبھی ذاتی طور پر ملاقات نہیں ہوئی تھی اور دہلی میں بھی اُن کی پہلی ملاقات بڑے عجیب و غریب حالات میں ہوئی تھی۔

کرشن چندر کے مطابق وہ ایک دن گرمیوں کے موسم میں پسینے سے تربتر ریڈیو اسٹیشن سے کچھ ہی دُوری پر واقع اپنی رہائش گاہ کی جانب جا رہے تھے کہ اچانک بخاری صاحب نے جو اس راستے سے گزر رہے تھے گاڑی روک کر دروازہ کھولا اور کہا کہ وہ گاڑی میں تشریف رکھیں مگر کرشن چندر نے بجائے اس کے کہ اُن کا شکریہ ادا کرتے، بڑے روکھے پن سے کہا "نو تھینکس"۔ پطرس صاحب نے کئی بار اصرار کیا مگر وہ ہر بار ان کی پیشکش ٹھکراتے رہے۔ آخر کرشن چندر کے رویے سے مایوس ہو کر وہ گاڑی بڑھا کر آگے چلے گئے۔ اس کے بعد کرشن چندر کو احساس ہوا کہ واقعی انھوں نے اتنے بڑے افسر سے بڑی زیادتی کی ہے۔ کہاں وہ معمولی پروگرام اسسٹنٹ اور کہاں ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل ایسا بڑا افسر مگر اب کیا ہو سکتا تھا...... 'جب چڑیاں چگ گئیں کھیت'۔

دراصل کرشن چندر ایک خوددار شخص تھے اور وہ اپنے کام سے کام رکھتے تھے۔ وہ افسروں کی چاپلوسی اور خوشامد سے دور رہتے تھے اور افسروں کے آگے پیچھے پھرنا اور اُن کی جھوٹی تعریف کرنا اُن کی فطرت میں نہ تھا۔ اُن میں شاید انانیت کا مادہ کچھ زیادہ ہی تھا اور وہ کسی کی پروا بھی نہیں کرتے تھے یہاں تک کہ ایک بار میٹنگ میں پطرس اُن کی کارکردگی پر انھیں ڈانٹنے لگے۔ کرشن چندر کو چاہیے تھا کہ وہ اسے برداشت کرتے یا بڑی حلیمی سے جواب دیتے مگر کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ انھیں ترکی بہ ترکی جواب دینے لگے۔ یہ بحث و مباحثہ کوئی پون گھنٹے جاری رہا اور اس کے بعد میٹنگ برخاست ہو گئی۔ کرشن چندر کے اس روکھے اور غیر مصلحتانہ رویے کا نتیجہ یہ نکلا کہ دیکھتے ہی دیکھتے اُن کے دیگر ساتھی ترقی کی سیڑھیاں طے کرنے لگے اور وہ وہیں پروگرام اسسٹنٹ ہی بنے رہ گئے۔

مذکورہ بالا زوردار مباحثے کے کچھ ہی لمحوں بعد پطرس نے کرشن چندر کو اسٹیشن ڈائرکٹر ایڈوانی

کے کمرے میں بُلا بھیجا۔ حکم بجا آوری تو ضروری تھی کہ اعلیٰ افسر کا حکم تھا مگر کمرے میں پہنچنے تک یہی سوچتے رہے کہ اُن کی کس 'گستاخی یا زبان درازی' کی انھیں سزا ملے گی؟ مگر جب وہ کمرے میں داخل ہوئے تو پطرس نے بڑھ کر انھیں گلے لگا لیا اور کہا برخوردار میں تمھارا امتحان لے رہا تھا۔ تم کامیاب رہے۔ پھر بڑے شفیقانہ انداز میں اُن کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے اپنے پاس کرسی پر بٹھایا اور اسٹیشن ڈائرکٹر سے مخاطب ہو کر کہا کہ اڈوانی جب تم دفتر آیا کرو تو سب سے پہلے اسے سلام کیا کرو۔ کیونکہ اس کے لچھن اچھے ہیں اور مستقبل میں یہ کچھ نہ کچھ ضرور بنے گا۔ اور بعدازاں پطرس کی یہ پیش گوئی سچ ثابت ہوئی کہ وہ اُردو کے عظیم المرتبت فکشن نگار بن گئے اور اُن کی دھوم سارے زمانے میں مچ گئی۔

کرشن چندر عام طور پر ریڈیو کے لیے ڈرامے سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی، اپیندر ناتھ اشکؔ اور عصمت چغتائی سے لکھواتے تھے حالانکہ امتیاز علی تاجؔ اور رفیع پیر اُس دور کے جانے مانے ڈراما نویس تھے اور پطرس کے قریبی دوستوں میں سے تھے مگر انھوں نے کرشن چندر کو کبھی مجبور نہیں کیا کہ وہ اُن سے ڈرامے لکھوائیں۔ ہاں ایک بار انھوں نے کرشن چندر سے پوچھا تھا کہ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ تم ان حضرات سے ڈرامے کیوں نہیں لکھواتے تو کرشن چندر نے جواب دیا تھا کہ ''جناب! میں اُن سے اس لیے نہیں لکھواتا کیونکہ وہ لوگ ذرا کلاسیکل انداز میں لکھتے ہیں اُن کی اُردو بھی بے حد مرصع ہوتی ہے اور میں موجودہ حالات پر آج ہی کی زبان میں لکھواتا ہوں اس لیے ان لوگوں سے رجوع کرتا ہوں۔''

ملازمت سے بددل اور برداشتہ کرشن چندر نے کئی بار ملازمت سے استعفیٰ دینے کی کوشش کی۔ اس پر ان کے رویے پر جھنجھلا کر ایک بار پطرس صاحب نے انھیں کہا بھی تھا ''کرشن تم اپنا استعفیٰ چھپوا کر اپنی جیب میں کیوں نہیں رکھ لیتے جب بیٹھے بٹھائے غصہ آئے پیش کر دیا مگر کچھ ہوگا نہیں۔ جب تک پطرس ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل ہے تمھارا استعفیٰ منظور نہیں ہوگا''۔ اس پر کرشن چندر آبدیدہ ہو گئے۔ اس پر کرشن چندر نے پوچھا کہ اگر وہ انھیں پسند کرتے ہیں تو اُن کی ترقی کیوں نہیں کرتے؟ اس پر پطرس نے جواب دیا کہ تمھارے خلاف انگریزی حکومت کی سی آئی ڈی نے اتنی دبیز فائل تیار کر رکھی ہے کہ تم جان ہی نہیں سکتے کہ میں کس قدر مشکل سے تمھاری ملازمت برقرار رکھ رہا ہوں۔ (پطرس سے ایک ملاقات از کرشن چندر) پھر کئی سال بعد جب ہندوستان آزاد ہو چکا تھا تو کرشن چندر نے پاسپورٹ کے لیے درخواست دی تو پہلے صوبائی سرکار پھر مرکزی

حکومت نے بھی ان کی درخواست نامنظور کردی۔ اس پر وہ ڈاکٹر سید محمود سے ملے جو کہ مرکزی وزیر تھے انھوں نے کرشن چندر کو بتایا کہ ان کو پاسپورٹ دینے میں اس لیے دشواری آرہی ہے کہ اُن کی انگریزی سرکار کے خلاف وزارت داخلہ کے پاس ایک لمبی چوڑی فائل پڑی ہے جو اڑچن بنی ہوئی ہے۔

کرشن چندر نے پطرس صاحب کے ساتھ جو اُن کے افسرِ اعلیٰ تھے، میٹنگ میں بے رخی اور درشتگی سے بات چیت کی تھی مگر پطرس نے اس پر بھی ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی کیونکہ وہ اُن کی صلاحیتوں سے اچھی طرح آگاہ تھے۔ ہاں کرشن چندر پطرس سے کی گئی اپنی تلخ کلامی پر پریشان و پشیمان رہے اور ان کے دل میں بے بنیاد خدشات پیدا ہوتے رہے مگر بالآخر یہ ختم ہو گئے اور اس میں پطرس کی کشادہ دلی کا بھی بڑا دخل ہے۔

دہلی میں قیام کے دوران ہی جب دوسری جنگِ عظیم نے کئی ملکوں کو تباہ و برباد کر دیا اور لاکھوں لوگ ہلاک اور بے وطن ہو گئے تو انھوں نے ہندی کے ممتاز و نامور شاعر ''اگیے'' اور ممتاز کہانی نویس جینندر جی کے اشتراک سے دہلی میں اینٹی فاشسٹ کانفرنس منعقد کرنے کا پروگرام بنایا اور چوں کہ وہ سرکاری ملازم تھے اور دفتر کی اجازت کے بغیر وہ ایسا نہیں کر سکتے تھے لہٰذا انھوں نے پطرس صاحب کو اس بارے میں آگاہ کرتے ہوئے ان سے اس میں شرکت کرنے کی اجازت چاہی جس کی انھوں نے اجازت دے دی۔

پھر اُن لوگوں نے مل کر ایک کنونشن کا اہتمام کیا جس میں شریک حضرات کو مطلع کیا گیا کہ اس کانفرنس میں کون کون سی قرارداد پاس کی جائے گی۔ اس کے بعد شاہد احمد دہلوی کو اس کانفرنس کا کنوینر بنایا گیا کیونکہ ایک تو وہ سرکاری ملازم نہیں تھے دوسرے اُن کا شمار دہلی کے نامور ادیبوں میں ہوتا تھا نیز وہ اُس دور کے مشہور ماہنامہ ساقی کے ایڈیٹر بھی تھے۔ اس کانفرنس کا انعقاد ہارڈنگ لائبریری کے ہال میں کیا گیا اور اس میں ایک سو کے قریب مندوبین نے شرکت کی۔ دو دن تک خوب گہما گہمی رہی اور اس شاندار جلسے میں مقالے پڑھے گئے، پُر جوش تقاریر ہوئیں اور کئی قرار دادیں پاس کی گئیں۔ اس کانفرنس میں سارا انتظام کرشن چندر نے ہی کیا تھا مگر اس کی کامیابی کا سہرا شاہد احمد دہلوی کے سر پر باندھا گیا اور اس میں پطرس کی حوصلہ افزائی بھی شامل تھی کہ انھوں نے انھیں کبھی آگے بڑھنے سے روکا نہیں۔ یہی نہیں انھوں نے اپنے رویے سے دیگر افسران پر بھی اس کا اظہار کر دیا تھا کہ وہ انھیں بے حد پسند کرتے ہیں۔

پطرس سے دہلی کے ادبا و شعرا بھی خفا تھے کہ انھوں نے سارے پنجابیوں کو آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن پر مامور کر دیا ہے اور دہلی والوں کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ اس پر ڈائرکٹر جنرل نے پطرس کو کمرے میں بلوا کر پوچھا تھا کہ کچھ حضرات کی شکایت ہے کہ تم نے اپنے دوستوں کو ریڈیو اسٹیشن میں بھرتی کر رکھا ہے تو پطرس نے جواب دیا ہے 'جی ہاں بالکل سچ ہے۔ کیا میں اپنے دوستوں کو نہیں تو کیا دشمنوں کو بھرتی کرتا جو مجھے بھی کام نہ کرنے دیتے اور خود بھی کام نہ کرتے۔'

وہ دَور آل انڈیا ریڈیو کا سنہری دور تھا کہ اُس دور میں اُردو کی برگزیدہ ادبی ہستیوں کا وہاں اجتماع ہوگیا تھا جن میں کرشن چندر کے علاوہ اس دور کے معروف ادبا و شعرا ن۔م۔راشد، سعادت حسن منٹو، اپیندر ناتھ اشک، دیویندر ستیارتھی، غلام عباس اور راجندر سنگھ بیدی وغیرہ شامل تھے اور جو ایک ٹیم بن کر کام کرتے تھے جنھوں نے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی دوڑ میں کئی یادگار ریڈیائی ڈرامے تحریر کیے۔ اسی زمانے میں کرشن چندر نے کئی طبعزاد ڈرامے لکھے جو نہ تو کسی دیگر زبان کے ترجمہ تھے اور نہ چربہ۔ اسی عرصہ میں انھوں نے اپنا یادگار ڈراما 'سرائے کے باہر' بھی پیش کیا جس پر بعد ازاں انھوں نے اسی نام کی فلم بھی بنائی جو پردۂ اسکرین پر کامیاب نہ ہو سکی۔ اس زمانے میں سعادت حسن منٹو اپنے تمام ساتھیوں پر سبقت لے گئے تھے کیونکہ انھوں نے ایک سال میں کوئی ایک سو کے قریب ڈرامے لکھے جو ایک غیر معمولی بات ہے اور ان میں ایک انفرادیت یہ بھی تھی کہ وہ براہِ راست ٹائپ رائٹر پر ڈرامے لکھتے تھے یعنی ہر تیسرے دن ایک ڈراما۔ اس دوڑ میں اپیندر ناتھ اشک بھی پیچھے نہیں تھے۔ انھوں نے بھی اس مسابقت میں اپنی کاوشیں صرف کیں اور کئی یادگار ڈرامے پیش کیے۔ اُن دنوں کا ذکر کرتے ہوئے کرشن چندر نے ''پطرس سے ایک ملاقات'' مضمون میں یوں لکھا ہے:

> ''یہ بڑے مزے کا زمانہ تھا۔ ہم تینوں میں ادبی بحثیں ہوتی تھیں۔ نوک جھونک ہوتی تھی۔ افسانے لکھے جاتے، ڈرامے لکھے جاتے۔ مضامین ایک دوسرے کو سنائے جاتے۔ پھر کچھ عرصے کے لیے بیدی بھی آگئے۔ احمد ندیم قاسمی بھی اور ن۔م۔راشد بھی۔ اور اس اجتماع نے اُردو ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ ندیم نے اپنا طویل آپیرا نظم کیا۔ بیدی نے پہلی بار ڈراموں کی طرف اپنی توجہ مبذول کی اور ن۔م۔راشد کی ''ماورا'' بھی انہی دنوں چھپی۔ دیویندر ستیارتھی بھی تشریف لائے۔ یونہی گھومتے گھامتے۔ دو ایک روز تو منٹو سے گاڑھی

چھنی مگر منٹو کے مزاج کی تلخی ستیارتھی کی شیریں بیانی کی ضد تھی، زیادہ دیر تک نہ نبھ سکی۔ منٹو نے ایک افسانے میں ستیارتھی پر چوٹ کی۔ ستیارتھی نے 'نئے دیوتا' میں اس کا جواب دیا۔ منٹو کو اس کا صدمہ ضرور ہوا۔ دو تین دن اس افسانے کا اثر رہا۔ آخر اُس نے کہا۔ "یہ نئے دیوتا" خوب ہے۔ چلو ہٹاؤ۔"

کرشن چندر لگ بھگ سوا سال تک آل انڈیا ریڈیو دہلی سے بحیثیت ڈراما انچارج منسلک رہے۔ پھر اُن کا تبادلہ لکھنؤ کر دیا گیا، جہاں بڑے بڑے ادیبوں کا اجتماع تھا اور وہاں قیام کے دوران انھیں فراق گورکھپوری، احتشام حسین، سبط حسن، اسرار الحق مجازؔ، حیات اللہ انصاری ایسی نامور اور برگزیدہ ہستیوں سے ملاقات کا موقع ملا۔ فراق گورکھپوری سے تو اُن کے اچھے قریبی مراسم ہو گئے اور دونوں ایک دوسرے کے ہاں اکثر آتے جاتے رہتے۔ فراق کو دعوت پر بھی مدعو کیا جاتا اور وہاں محفل میں فراقؔ اپنے اشعار و گفتگو سے چھا جاتے۔

لیکن یہاں انھوں نے کچھ ہی مہینے گزارے تھے کہ پونے کے فلم پروڈیوسر ڈبلیو زیڈ احمد نے انھیں بطور "مکالمہ نویس" اپنی کمپنی جوائن کرنے کی آفر بھیج دی۔ کرشن چندر کو اس پیشکش سے بڑی مسرت حاصل ہوئی کہ وہ ایک مدت سے فلموں سے وابستہ ہونا چاہتے تھے کیونکہ وہ سرکاری ملازمت میں اپنے آپ کو پنجرے میں بند پرندے کی طرح سمجھتے تھے جسے کوئی آزادی نہیں تھی اور کام بھی اتنا تھا کہ انھیں اپنی تخلیقات کو معرضِ وجود میں لانے کا وقت ہی نہیں ملتا تھا اور اس کے برعکس فلموں میں پیسہ بھی بہت تھا۔ لہٰذا انھیں یہ آفر ایک غیبی نعمت سی نظر آئی اور انھوں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ اُن کے ڈائرکٹر سوم ناتھ چب نے جو لاہور میں ان کے انگریزی کے پروفیسر تھے انھیں بہت سمجھایا اور تلقین کی کہ وہ ملازت سے استعفیٰ نہ دیں کیونکہ سرکاری ملازمت میں ترقی کے بہت مواقع ہیں اور اُن کے اسٹیشن ڈائرکٹر بننے کے بھی امکانات ہیں مگر انھوں نے ایک نہ سُنی اور استعفیٰ دے کر پونے چلے گئے۔

پونے کی یادیں:

پونے میں کرشن چندر کو بہت سی مقتدر ادبی شخصیات سے قربت نصیب ہوئی جن میں جوشؔ ملیح آبادی، ساغرؔ نظامی، اختر الایمان خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس جگہ کا ماحول کرشن چندر کو بہت بھایا۔ ایک تو وہ عالمِ شباب میں تھے اور اُن میں حسن و جمال کے تئیں ایک غیر معمولی

جھکاؤ بھی تھا اور پھر وہ ایک رومان پرست نوجوان تھے جس کے دل و دماغ میں حسن و شباب کی رعنائیاں اور رنگینیاں بے طرح چھائی ہوئی تھیں اور فلمی دنیا تو سراپا حسیناؤں اور رنگینوں کا ایک خوبصورت سحر آمیز مرکز تھا۔ جہاں پہنچ کر انھیں احساس ہوا کہ وہ سچ مچ جنت میں پہنچ گئے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ شہر حسن و شباب کی رنگینیاں ہی نہیں بکھیرتا تھا بلکہ یہاں بہت سی نامور ادبی شخصیات کا بھی جمگھٹا تھا جو زیادہ تر شالیمار سے وابستہ تھیں۔

یہاں انھوں نے اپنا ڈراما اسٹیج پر پیش کرنے کی تیاری کے دوران اُس دور کی مشہور اداکارہ سنہیہ پربھا پردھان سے رابطہ قائم کیا اور وہ اکثر مل کر ڈرامے اور دیگر سیاسی اور سماجی امور پر تبادلۂ خیال کرتے تھے۔ اُن ہی دنوں دوسری جنگِ عظیم میں روس اتحادی ممالک کے ساتھ جرمنی اور اٹلی کے متحدہ محاذ کے خلاف صف آرا ہو گیا جس سے کمیونسٹوں کے سامنے ایک مسئلہ پیدا ہو گیا کہ وہ کس کا ساتھ دیں؟ ملک کی قوم پرست طاقتوں کا یا اتحادیوں کا جس میں برطانوی سامراج بھی شامل تھا جبکہ گاندھی جی نے انگریزوں کو ہندوستان چھوڑنے کی دھمکی دے دی تھی۔ اس طرح کے مسائل پر شالیمار میں اکثر و بیشتر مباحثے ہوتے رہتے تھے جن میں سنہیہ پربھا پردھان، کرشن چندر، راما نند ساگر، عذرا بٹ، محسن عبداللہ، مسعود پرویز، حمید بٹ وغیرہ حصہ لیا کرتے تھے۔ بالآخر کمیونسٹوں نے فیصلہ کیا کہ انھیں انگریزوں کا ساتھ دینا چاہیے کہ اس سے اشتراکیت کو تقویت ملے گی۔ اسی دوران اُن کا ڈراما 'سرائے کے باہر' اور سنہیہ لتا پردھان کا ڈراما دکھایا گیا۔

یہاں پر اُن کی دوستی معروف اداکار شیام سے ہو گئی جو یاروں کا یار تھا اور اُردو شعر و ادب کا دیوانہ۔ وہ جلد ہی کرشن چندر کا ہم پیالہ، ہم نوالہ اور ہمراز بن گیا۔ وہ جوشؔ ملیح آبادی صاحب کا بڑا معتقد تھا اور اُن کی شاعری کو بے حد پسند کرتا تھا مگر نجی بحث و مباحثے میں اُن کی عظیم شخصیت سے مرعوب ہو کر خاموشی اختیار نہیں کرتا تھا اور اُن کی ہاں میں ہاں ملانے کے بجائے اُن کی بات کے خلاف اپنا نظریہ و موقف بغیر جھجک پیش کرتا تھا۔ وہ اُن کی محفل میں بڑا مقبول تھا۔

شالیمار میں جوشؔ اور ساغرؔ کی پٹتی نہیں تھی اور اُن میں نوک جھونک چلتی رہتی تھی۔ خصوصاً جوشؔ صاحب ساغرؔ نظامی کی شاعری میں خامیاں نکالتے رہتے تھے اور انھیں شاعری سے متعلق مشورے دیتے رہتے تھے جنھیں کبھی تو ساغرؔ قبول کر لیتے اور کبھی رد کر دیتے۔ غرضیکہ ان دونوں کے بیچ اختلاف و بغض کی ایک ایسی خلیج حائل تھی جسے پاٹنا بے حد مشکل تھا، وہ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے مواقع ڈھونڈتے رہتے تھے۔

ایک بار ڈائرکٹر ڈبلیو زیڈ احمد نے اپنی محبوبہ اور فلموں کی ہیروئن نینا کو جس نے 'ایک رات' اور 'من کی جیت' وغیرہ میں کام کیا تھا اسکرین پلے ڈیپارٹمنٹ کا انچارج مقرر دیا، جس کے تحت وہ جوشؔ ایسے عظیم المرتبت شاعر اور ساغرؔ اور کرشن چندر ایسی معروف ہستیوں کے اسکرین پلے، گیت اور مکالمے وغیرہ کی جانچ پڑتال کر سکتی تھی۔ جب یہ فیصلہ ہوا تو کرشن چندر اسٹوڈیو میں موجود نہیں تھے۔ فیصلہ جوشؔ اور ساغرؔ کو دکھایا گیا جو اُس وقت وہاں حاضر تھے۔ جوشؔ نے ساغرؔ سے کہا۔ ''دیکھی آپ نے بے ہودگی؟ میرا تو خون کھول گیا۔'' ساغرؔ غصہ سے بولے۔ ''وہ کل کی چھوکری اسکرین پلے کیا جانے؟ اسے ہمارا ہیڈ بنا دیا گیا ہے یعنی وہ ہم پر راج کرے گی۔'' جوشؔ صاحب نے ساغرؔ صاحب کو بھڑکاتے ہوئے کہا۔ ''اب اگر وہ احمد کے دل پر راج کر رہی ہے تو اس میدان میں بھی راج کرے گی میاں!''۔ ساغرؔ بولے'' لاحول ولاقوۃ میں تو ہرگز ہرگز ایک عورت کے نیچے کام کرنے کو تیار نہیں ہوں''۔ جوشؔ'' واقعی ہے تو ذلت''۔ ساغرؔ:'' اجی! اس بے عزتی کی نوکری سے بھوکا مر جانا بہتر ہے۔ میں آج ہی استعفیٰ دے دیتا ہوں''۔ جوشؔ:'' آج کیا ابھی دے دیجیے۔ میں بھی استعفیٰ داغ دیتا ہوں۔ احمد صاحب کو ہوش آجائے گا۔'' ساغرؔ نے اسی دم مشتعل ہو کر استعفیٰ لکھا۔ جوشؔ نے اس کے لفظوں کی بندش کو ٹھیک کیا اور چپراسی کے ہاتھ احمد صاحب کے پاس بھیج دیا۔ ساغرؔ نے اب جوشؔ سے کہا۔'' اب آپ بھی استعفیٰ لکھیے۔...... جوشؔ: ''ابھی لکھتا ہوں (گھڑی دیکھ کر) ذرا گھر ہو آؤں۔ ایک کام یاد آ گیا ہے۔'' جوشؔ گھر چلے گئے اور ڈیڑھ دو گھنٹے بعد واپس آئے تو ساغرؔ نے انھیں استعفیٰ لکھنے کی بابت یاد دہانی کرائی، جوشؔ نے کہا۔'' اب کھانا آ گیا ہے۔ کھانا کھالیں تو لکھتا ہوں۔'' کھانا کھا کر پھر ساغرؔ نے یاد دلایا تو جوشؔ نے کہا۔'' کھانا کھا کر ذرا جھپکی لے لیں تو لکھ کر بھجوا دیں گے۔'' غرضیکہ ساغرؔ انھیں بار بار اپنا استعفیٰ لکھنے کے لیے کہتے رہے اور جوشؔ برابر ٹالتے رہے۔ دریں اثنا ساغرؔ کا استعفیٰ ڈبلیو زیڈ احمد نے منظور کر لیا۔ کرشن چندر اسٹوڈیو آئے تو انھیں صورتِ حال کا پتہ چلا۔ انھوں نے جوشؔ سے شکایت کی'' آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا''۔ اور ساغرؔ سے کہا۔'' کم از کم میرا انتظار تو کر لیا ہوتا''۔ ساغرؔ جوشؔ کی طرف اشارہ کر کے بولے۔''انھوں نے مشورہ دیا۔ میں نے استعفیٰ لکھ کر بھیج دیا اب یہ خود اپنا استعفیٰ نہیں بھیج رہے ہیں۔ ٹال مٹول کر رہے ہیں۔'' کرشن چندر نے جوشؔ کی طرف دیکھا۔ انھوں نے کہا۔'' بھئی ہم تو مذاق کر رہے تھے۔ یہ اسے سچ سمجھ بیٹھے اور استعفیٰ داغ دیا۔'' کرشن چندر کے کہنے پر جوشؔ نے جھوٹی ہامی بھر لی کہ اگلے دن ڈبلیو زیڈ احمد سے اپنا فیصلہ واپس

لینے کے لیے کہیں گے لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ ساغر کو نوکری سے ہاتھ دھونے پڑے۔ کرشن چندر کے الفاظ میں اس طرح ''ایک شاطر پٹھان نے ایک سیدھے سادے پٹھان کو مات دے دی۔''(۷)

کرشن چندر کا پونے کا زمانہ ان کی زندگی کا یادگار اور رنگین دَور تھا۔ یہاں انھوں نے زندگی خوب انجوائے کی۔ ہر طرح کے آرام وعیش سے لطف اُٹھایا۔ وہ خوبصورت ہیرو ہیروئنوں سے ملے اور اُن سے قربت نصیب ہوئی۔ پونے اور بمبئی میں قیام کے دوران انھوں نے دو بار ریس کھیلی۔ پونے میں انھوں نے پہلی بار ریس کھیلی اور دس روپے جیتے۔ بمبئی میں دوسری بار کھیلی اور دس روپے ہارے۔ پونے کی ریس میں ان کی ملاقات عادل رشید نے جو کہ بمبئی سے ماہنامہ ''عذرا'' نکالتے تھے اور فلم پبلسٹی کمپنی کے مالک تھے، اُس دَور کی شاہکار فلم ''دیوداس'' کے ہدایت کار بروا اور ان کی اہلیہ جمنا سے کرائی جو کہ ''دیوداس'' کی ہیروئن تھی اور جس کے چرچے پورے ملک میں تھے۔ کرشن چندر کو اُن سے مل کر بڑی مسرت ہوئی کیونکہ اُس دَور کے نوجوانوں کے لیے یہ دونوں بڑی شہرت کی حامل ہستیاں تھیں اور لوگ اُن کی ایک جھلک پانے کو ترستے تھے۔ وہ اس فلمی جوڑے سے اس لیے بھی متاثر ہوئے کہ وہ دونوں بڑے سادہ لباس میں تھے۔ پی سی بروا ایک سادہ سی سفید دھوتی اور معمولی سی چپل پہنے تھے...... اور جمنا جو اتنی بڑی اسٹار تھی، معمولی سی چپل اور اُونچی سی ساڑی پہنے ہوئے تھی اور اس کے ٹخنے ننگے تھے۔ اُسے دیکھ کر آدمی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کیا یہی جمنا ہے...... ''دیوداس کی پارو''؟۔

کرشن چندر بوجوہ شالیمار کی زندگی سے کچھ اوب سے گئے تھے اور وہ بمبئی جا کر کسی کمپنی سے وابستہ ہونے کی سوچنے لگے۔ اسی دوران ایک ناخوشگوار واقعہ سے ان کی انا کو بڑی ٹھیس پہنچی جس سے اب ان کے لیے اس کمپنی سے منسلک رہنا بے حد مشکل ہو گیا۔ اس واقعہ کا پس منظر یہ ہے کہ کرشن چندر کے دوست چیتن آنند اور بلراج ساہنی شالیمار پکچرز میں ملازمت کے لیے پہنچے لیکن ڈبلیو زیڈ احمد نے انھیں خاطر خواہ تنخواہ کی پیشکش نہ کی۔ اس پر کرشن چندر نے ان دونوں کو مشورہ دیا کہ وہ اس سلسلے میں شالیمار کی ہیروئن اور احمد صاحب کی محبوبہ 'نینا' سے ملیں اور اس کی سفارش کروا سکیں تو احمد صاحب آپ کی تنخواہ ضرور بڑھا دیں گے لیکن انتہائی رازدارانہ انداز میں کہی گئی یہ بات احمد صاحب تک پہنچ گئی اور انھوں نے کرشن چندر سے پوچھا کہ انھوں نے نینا سے سفارش کی بات کیوں کی تھی؟ کرشن چندر شرم وندامت سے کچھ کہہ نہ پائے۔ اس کے بعد احمد نے

کہا کہ آج سے ہم آپ کی تنخواہ بڑھائے دیتے ہیں۔ یہ سُن کر انھیں ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے زور سے اُن کے منہ پر تھپڑ رسید کیا ہو۔ تب اُس دن انھوں نے مصمم ارادہ کرلیا کہ اب وہ شالیمار میں نہیں رکیں گے اور بمبئی چلے جائیں گے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ شالیمار کے قیام کا زمانہ اُن کی زندگی کا یادگار اور مسرت آمیز زمانہ تھا اور وہاں رہ کر انھوں نے ''ان داتا'' اور ''موبی'' ایسے شاہکار افسانے لکھے اور ساتھ ہی پونے کے کیف آور ماحول اور رنگینیوں اور سرمستیوں سے بھی لطف اندوز ہوئے۔

پونے میں کرشن چندر نے کئی حسیناؤں سے عشق کیا جن میں ایک لڑکی ثمینہ بھی تھی۔ یہ عشق پونے میں قیام کے دوران کی داستان ہے۔ شمی اور اُس کی بہن بمبئی سے پونے آئیں اور انھیں جوشؔ صاحب کے پڑوس میں ایک چھوٹا سا بنگلہ کرائے پر مل گیا۔ کرشن چندر ثمینہ سے عشق کرنے لگے اور مہندر ناتھ اُس کی بہن سے۔ ثمینہ عام شکل وصورت کی لڑکی تھی مگر 'عشق نہ پوچھے جات کجات' والا معاملہ تھا، تاہم وہ بلا کی ذہین تھی اور فقرے تراشنے میں اس کا جواب نہیں تھا۔ اسی ثمینہ کو انھوں نے اپنی فلم 'سرائے کے باہر' میں بطور سائیڈ ہیروئن لیا تھا۔ اُن دنوں کرشن چندر اُس خاتون کے عشق کی آگ میں بُری طرح جل رہے تھے اور وہ اس کی ناز برداری میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے تھے اور اُس پر روپیہ بھی پانی کی طرح بہاتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ اُن کی بہت بڑی کمزوری بن گئی تھی اور اس محبوبہ دلنواز کی دلداریاں انھیں کچھ سوچنے کا موقع ہی نہیں دیتی تھیں۔

کرشن چندر کے کچھ معاشقوں کا ذکر جگدیش چندر ودھاون نے بھی کیا ہے۔ ان میں ایک اُس دور کی مشہور شاعرہ شاہدہ نکہت بھی تھی جو اپنے مسحور کن ترنم اور حسن وجمال سے مشاعروں کی جان بنی ہوئی تھی۔ وہ ظاہری اور باطنی حسن سے مزین تھی اور اس کے کئی چاہنے والے تھے۔ خود ساحرؔ ہوشیار پوری بھی اُس کے عاشقوں میں سے تھے مگر کرشن چندر سے اس کے تعلقات کوئی چھ ماہ تک ہی رہے کیونکہ اس کے مختلف حضرات سے ''عشق'' کو کرشن چندر برداشت نہ کر سکے اور یہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی خواتین تھیں جن کی قربت سے کرشن چندر محظوظ ہوئے۔ اُن کا آخری رومان سلمیٰ صدیقی سے ہوا اور اس سے شادی کے بعد وہ اُس کے اتنے دیوانے ہوگئے کہ انھیں کسی اور سے رومانس لڑانے کی فرصت ہی نہ ملی یا اُن کی بے قرار روح کو اس کی قربت سے چین سا آگیا تھا۔

بمبئی میں قیام:

کرشن چندر پونے سے ۱۹۴۶ء میں نقلِ مکانی کر کے بمبئی چلے گئے جہاں انھیں بمبئی ٹاکیز میں انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ڈیڑھ ہزار روپے ماہوار پر ملازمت مل گئی تھی ۔اس کے علاوہ انھوں نے ملاڈ میں ایک بنگلہ کرائے پر لے لیا جس کا کرایہ بھی کمپنی کے ذمہ تھا۔ یہاں بحثیت انچارج اسٹوری ڈیپارٹمنٹ کوئی ایک سال تک کام کیا، پھرانھوں نے اُس ملازمت کو خیر باد کہہ دیا اور خود فلمی دنیا میں بطور پروڈیوسر ڈائرکٹر کود پڑے۔

کرشن چندر نے ۱۹۴۷ء میں اپنی پہلی فلم ''سرائے کے باہر'' بنائی تھی جو اُن کے اسی نام کے ریڈیائی ڈرامے پر مبنی تھی۔ اس فلم کے ڈائرکٹر پروڈیوسر وہ خود ہی تھے اور اس میں انھوں نے بطور ہیرو اپنے بھائی مہندر ناتھ کو لیا تھا اور اس کی ہیروئن سیتا دیوی تھی۔ ان کے علاوہ اس فلم میں ہیماوتی، راج مہرہ، ثمینہ اور ککو وغیرہ نے کام کیا تھا اور اس کے موسیقار تھے ڈی سی دت۔ فلم بُری طرح ناکام ہوگئی۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی دوسری فلم ''راکھ'' بنانی شروع کی لیکن اس فلم کو پردۂ اسکرین پر نمودار ہونا نصیب نہ ہوا اور وہ ڈبوں میں بند ہی پڑی رہ گئی۔ بہر حال ان کی اس فلم میں بھی ہیرو مہندر ناتھ ہی تھے۔ بقول مہندر ناتھ:

''جب دونوں فلمیں ناکام رہیں تو طلسم ٹوٹ گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کرشن چندر عرش سے فرش پر آرہے۔ یارانِ مصلحت آمیز ہوا ہو گئے۔ تینوں کاریں فروخت ہو گئیں۔ سب نوکر چاکر نکال دیے گئے۔ کرشن چندر کے لیے اقتصادی بحران کا دور شروع ہو گیا۔ ان کا کیسہ نہ صرف خالی تھا بلکہ اُن کے سر پر بھاری بھرکم قرضہ بھی تھا جس کی ادائیگی اس وقت کے حالات کے مطابق محال معلوم ہوتی تھی۔ فلم پروڈکشن کے دوران اُن کا اپنے ادب سے ناطہ ٹوٹ سا گیا تھا۔ اُسے نئے سرے سے استوار کرنا پڑا۔ فلمی دنیا میں نئے رابطے بنانے پڑے۔ زندہ رہنے کے لیے ازسرنو تگ ودو کرنی پڑی...... لیکن سب نامراد گھڑیوں کی طرح یہ گھڑی بھی گزر گئی۔''

کرشن چندر نے لگ بھگ دو درجن فلموں کے کہانی اسکرین پلے اور مکالمے لکھے جن میں ہمراہی، دو چور، ممتا، من چلی، پانچ لوفر، شرافت خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

دہلی میں عارضی قیام:

کرشن چندر ۱۹۶۰ء کے آخر میں بمبئی سے دہلی آگئے اور یہاں وہ مستقل طور پر اپنی پہلی بیوی وِدیاوتی سے دُور سلمیٰ صدیقی کے ساتھ رہنا چاہتے تھے مگر حالات ایسے بن گئے کہ انھیں مجبوراً دوبارہ بمبئی جانے کا پروگرام بنانا پڑا اور ۱۹۶۲ء کے اوائل میں وہ دہلی کو خیر باد کہہ کر پھر واپس بمبئی چلے گئے۔ حالانکہ سلمیٰ سے شادی کے بعد انھوں نے ماڈل ٹاؤن میں مکان کرائے پر لے لیا تھا مگر اس دوران ان کی آمدنی کے ذرائع مسدود ہو گئے تھے اور اُن کی معاشی حالت اتنی خستہ ہو گئی کہ اُن کے لیے دہلی میں رہنا انتہائی مشکل ہو گیا لہٰذا اب اُن کے پاس کوئی چارہ نہ رہا اور وہ پھر بمبئی چلے گئے اور عمر بھر اسی شہر میں رہے اور یہیں آخری سانس لی۔

بمبئی میں واپسی کے بعد وہاں رہائش گاہ کا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ اُسے حل کرنے میں ایک ماہ لگ گیا اور اس دوران وہ ایک ہوٹل میں قیام پذیر رہے اور جب اُن کے معاشی حالات دگرگوں ہو گئے تو دوستوں نے بھی اُن سے منہ موڑ لیا اور اُن کی کسی طرح کی مالی امداد نہ کی بلکہ وہ اُن سے دُور دُور رہے کہ مبادا کچھ مانگ نہ بیٹھیں۔ اس بحرانی دور میں بھی انھوں نے بڑے صبر و تحمل سے حالات کا مقابلہ کیا جس کے نتیجے میں جلد ہی انھیں کہانیاں لکھنے کے ساتھ ساتھ فلموں میں بھی کام ملنے لگا اور مدت قلیل میں اُن کی گاڑی پٹری پر آ گئی۔

ازدواجی زندگی:

کرشن چندر نے جب تعلیم ختم کرنے کے بعد ریڈیو میں ملازمت اختیار کر لی تو ہر ماں کی طرح اُن کی والدہ کو بھی اُن کی شادی کا شوق چرایا اور وہ اُن سے شادی کے لیے اصرار کرنے لگیں مگر کرشن چندر اس تجویز پر ہاں ہی نہیں کرتے تھے۔ کبھی وہ مطالبہ کرتے کہ لڑکی بی اے پاس ہو، کبھی کہتے گوری چٹی ہو، پتلی اور چاندی حسین و جمیل ہو۔ نتیجہ یہ کہ جو بھی رشتہ آتا اُن کی کسوٹی پر پورا نہ اُترتا۔ رشتہ دار خصوصاً موسیاں جو اُن کی شادی دیکھنے کے لیے بے چین تھیں جب گھر میں آتیں تو گھر میں ہنگامہ برپا ہو جاتا۔ آخر روز روز کی تکرار سے تنگ آ کر انھوں نے شادی کے لیے ہاں کر دی۔

تب اُن کے گھر والوں نے لاہور کے ایک معزز گھرانے میں ایک پڑھی لکھی لڑکی وِدیاوتی

سے اُن کی شادی کردی جو کہ انڈر گریجویٹ تھی (یاد رہے کہ اُن دنوں لڑکیوں کو مڈل یا میٹرک تک ہی عموماً تعلیم دی جاتی تھی)۔شادی کب ہوئی اس کے بارے میں کرشن چندر اور اور اُن کی اہلیہ ودیاوتی کی رائے الگ الگ ہے۔جب افسانہ نگار رام لعل نے اُن کی شادی کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ اُن کی شادی بیس سال کی عمر میں ہوئی یعنی قریباً ۱۹۳۴ء کے قریب جبکہ اُن کی بیوی نے رحمان نیر ایڈیٹر بیسویں صدی اور روبی کو ایک انٹرویو میں بتایا تھا کہ اُن کی شادی ۱۹۳۹ء/ ۱۹۴۰ء کے قریب ہوئی تھی اور موخر الذکر تاریخ زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔اگر کرشن چندر کی شادی بیس سال کی عمر میں ہوئی ہوتی تو آج اُن کے بیٹے کی عمر ستر سال سے اُوپر ہوتی۔کیونکہ پہلا بچہ عموماً شادی کے دو تین سال کے اندر پیدا ہو ہی جاتا ہے جبکہ اُن کی بڑی بیٹی کی پیدائش ۱۹۴۲ء میں ہوئی تھی۔

تاہم اس شادی سے کرشن چندر کو بہت مایوسی اور نا اُمیدی ہوئی کیوں کہ اُن کے سپنوں کی حسین وجمیل ملکہ جس کے انھوں نے سپنے دیکھے تھے ٹوٹ کر آئینے کی کرچیوں کی طرح بکھر گئے کیونکہ وہ خوبصورت ہونے کے بجائے عام لڑکی تھیں اور پھر اُن کا مزاج بھی سخت۔دونوں کے مزاج مین زمین آسمان کا فرق تھا۔ایک دن تھا تو دوسرا رات۔اُن کی بیوی کی سسرال والوں سے بھی نہیں بنی۔بقول اپیندر ناتھ اور بہنوئی ریوتی سرن شرما ودیاوتی ''اصلاً وخصلتاً حد درجہ تنگ نظر، تنگ دل، خسیس اور بد خصلت خاتون تھیں۔گھر آئے ادیب احباب اور دیگر اعزا وا قارب سے خندہ پیشانی سے ملنا اور اُن کی موزوں اور مناسب خاطر تواضع اُن کی فطرت سے بعید''۔(۸)

کرشن چندر اس شادی سے اتنے ناخوش تھے کہ انھوں نے گھر والوں سے یہاں تک کہہ دیا کہ انھوں نے اُن کے گلے میں اُستروں کی مالا ڈال دی ہے لیکن وہ اپنی بیوی سے کچھ نہ کہتے۔وہ بہت ہی سخت مزاج تھیں اور کرشن چندر پر کئی طرح کی پابندی عائد کرتی تھیں۔ایک بار ان کی چھوٹی بہن سرلا اُن کے ہاں رہنے بمبئی گئی تھیں تو اُن کی بیوی کا حکم تھا کہ آپ سرلا سے بات نہیں کر سکتے۔آخر آپ کے گھر والے برات کی برات لے کر یہاں کیوں پڑے ہیں؟ کرشن جی انھیں خوش رکھنے کے لیے اپنے پریوار کے ساتھ بہت کم بات چیت کرتے مگر جب وہ گھر میں نہ ہوتیں تو گھنٹوں بیٹھ کر باتیں کرتے۔

درحقیقت اُن دونوں کی عادتیں اور مزاج ایک دوسرے کے متضاد تھے اور اُن میں کوئی میل نہیں تھا۔ایک مشرق تھا تو دوسرا مغرب۔اس کے باوجود کرشن چندر نے دوسری شادی کرنے کے

بعد بھی اُن کی مالی ذمہ داریاں نبھائیں اور تینوں بچوں کی تعلیم و تربیت کی جانب پوری توجہ دی۔ اُن کی چھوٹی بیٹی دماغی طور پر معزور تھی اور انھوں نے اس کے علاج معالجے میں کوئی کسر نہ چھوڑی یہاں تک کہ وہ اس کے علاج کے لیے اُسے رانچی بھی لے کر گئے مگر بیوی کو صرف مالی مدد ہی نہیں اپنے شوہر سے بہت کچھ اور بھی چاہیے۔ آخر اُس کے بھی تو ارمان، خواہشیں، امنگیں ہوتی ہیں لیکن کرشن نہ تو انھیں ذہنی تسکین بخش سکے نہ اُن کے اندرون زخمی کے گھاؤ ہی بھر سکے اور پھر جب انھوں نے سلمیٰ سے شادی کر لی تو اُن کے بیچ کی خلیج مزید بڑھ گئی۔ حتیٰ کہ وہ پہلے سے بھی زیادہ چڑچڑی اور غصیلی ہو گئیں کیونکہ کوئی بھی عورت اپنی سوتن پسند نہیں کرتی چاہے وہ کسی کی بھی بیوی ہو۔ اس لیے کرشن چندر کے تئیں اُن کے دل میں غصہ اور مزید بڑھ گیا جس کا اظہار انھوں نے کئی بار کیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ افراد نے بھی اس میں جلتی پر تیل کا کام کیا ہو۔ تاہم انھوں نے کرشن چندر کو پریشان کرنے میں ہر ممکن قدم اُٹھائے حتیٰ کہ اُن پر مقدمہ بھی درج کروایا جس کے نتیجے میں کرشن چندر اور سلمیٰ کی گرفتاری بھی عمل میں آئی اور تھانے میں ضمانت پر رہا ہوئے۔ اس بارے میں انھوں نے اپنے چھوٹے بھائی اپیندر ناتھ جنھیں گھر میں اوم کہا جاتا تھا کو لکھے ایک خط میں تحریر کیا تھا۔

”پیارے اوم!

تمھارا خط مل گیا تھا۔ ماں جی کو روپے بھیج دیے تھے۔ اس مہینے تمھیں پیسے بھیجنے کا ارادہ تھا مگر ان دنوں ایک مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہوں۔ ودیا نے مجھ پر اور سلمیٰ پر فوجداری دعویٰ کر دیا ہے۔ ہمارے وارنٹ نکلوائے، گرفتاری کرائی، تھانے میں ضمانت ہوئی اور اب ۱۶ر جولائی کو یعنی اس مہینے کی سولہ تاریخ کو مقدمے کی پہلی پیشی ہے۔ دعویٰ سراسر جھوٹا ہے۔ الزام یہ ہے کہ ہم نے آج سے پانچ سال پہلے ہندو شادی کی تھی جو کہ سراسر خلاف قانون ہے۔ نقلی اور جھوٹے گواہ تیار کیے ہیں اور یہ الزام لگایا ہے کہ شادی آج سے پانچ سال پہلے مہندر جی نے اپنے دادر کے فلیٹ میں کرائی تھی۔ اب تم خود سوچ لو یہ عورت کیسی ہے؟ اور ماں جی کو بھی بتادو جو دن رات ودیا کے غم میں گھلی جاتی ہیں۔ سُنا ہے کہ رنجن کو بھی میرے خلاف عدالت میں پیش کیا جائے گا۔ یہ سب باتیں تمھیں اس لیے لکھ رہا ہوں کہ تم خبردار رہو اور کسی ایرے غیرے کی باتوں میں

نہ پھنسو۔ نہ گھر کے اندر کسی ایرے غیرے کو آنے دو۔ میرے خطوط کو سنبھال کر
تالے میں رکھو۔ میرے خطوں کا ایک ٹرنک ماں جی کے پاس رکھا ہے۔ اسے
سنبھال کر تالے میں رکھو۔ ان خطوط کی ضرورت اب پڑے گی۔ کسی کو خبر مت
بتاؤ۔ صرف گھر کے لوگوں تک رکھو۔ ریوتی کو بھی آج خط لکھ رہا ہوں۔
اب گھبرانے اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں کیس کو بڑی محنت سے لڑا
جائے گا۔
تمھارا بھائی کرشن چندر''۔(۹)

خانگی جھگڑے چلتے رہے لیکن کرشن چندر نے اپنی خانگی ذمہ داریوں سے کبھی منہ نہ موڑا اور وہ باقاعدگی سے اپنی بچوں کے مستقبل کے بارے میں فکرمند رہے اور اپنے تینوں بچوں کپیلا، الکا اور نرنجن کی پرورش و پرداخت اور تعلیم میں پوری طرح دلچسپی لیتے رہے۔

اُن کا اکلوتا بیٹا رنجن پڑھائی میں کمزور تھا اور کوشش کے باوجود میٹرک سے آگے نہ بڑھ سکا۔ کرشن چندر کو اُس کے مستقبل کی بڑی فکر رہتی تھی اور وہ چاہتے تھے کہ اُن کا بیٹا کسی لائق بن جائے۔ عادات و خصائل میں وہ اپنی ماں پر گیا ہے اور کرشن چندر اور اُس میں کوئی قدرِ مشترک نہیں تھی۔ انھوں نے پروگرام بنایا کہ وہ اپنی کتابوں کی اشاعت کا کام اسے سونپ دیں مگر بوجوہ وہ اس کام میں بھی ناکام رہے پھر انھوں نے ایک شیڈ لے کر اس میں اسے پرنٹنگ پریس لگوا دیا۔ اب یہی پریس ہی اُس کا ذریعۂ معاش ہے۔ اس کے علاوہ کرشن چندر کی بڑی تمنا تھی کہ اُس کی شادی اُن کے جیتے جی ہو جائے مگر ایسا نہ ہو سکا۔ بعد ازاں اُن کے بھائی کے توسط سے اُس کی شادی دہلی میں ہو بھی گئی لیکن یہ شادی کامیاب ثابت نہ ہوئی اور کچھ مدت بعد ہی دونوں میاں بیوی نے علاحدگی اختیار کر لی۔ کہا جاتا ہے کہ اس علاحدگی میں بھی ودیاوتی کا ہاتھ تھا۔

اُن کے بیٹے کے برعکس سلمیٰ کا بیٹا راشد خورشید منیر جسے پیار سے گھر میں ببلو کہتے تھے اور جو اُن کی شادی کے وقت گیارہ سال کا تھا رنجن کے مقابلے میں بڑا کامیاب ثابت ہوا۔ اسے کرشن چندر نے اپنے حقیقی بچے کی طرح پالا پوسا۔ اس ہونہار بچے نے پونا فلم انسٹی ٹیوٹ سے ڈائرکشن اور فوٹو گرافی کا کورس مکمل کیا اور فلمیں بنانے لگا۔ کہا جاتا ہے کہ کرشن چندر کی ایک کہانی ''پانچ لوفر'' خریدنے کے لیے کئی ڈائرکٹر آئے مگر انھوں نے انکار کر دیا کیونکہ اُن کی خواہش تھی کہ اس کہانی پر فلم راشد منیر ہی بنائے۔ وہ اس سے بے حد پیار کرتے تھے اور انھوں نے اُس کی شادی

بڑی شان وشوکت سے کی تھی، جس میں اس کے نانا رشید احمد صدیقی اور نانی نے بھی شرکت کی تھی۔ اس میں کرشن چندر نے ایسے ہی حصہ لیا جیسے وہ اس کے سگے باپ ہوں اور راشد نے بھی انھیں حقیقی باپ کی طرح ہی اُن کے تئیں پیار، اطاعت اور فرمابرداری کا اظہار کیا۔ جب کرشن چندر اسپتال میں تھے تو وہ رات بھر اپنی والدہ کے ساتھ اُن کے سرہانے بیٹھا رہتا تھا اور اُن کی صحتیابی کے لیے دعائیں مانگتا اور کچھ پڑھ کر اُن پر پھونکا کرتا تھا۔ افسوس کہ یہ ہونہار لڑکا جس کا مستقبل بہت روشن تھا اچانک بھری جوانی میں ہی رحلت کر گیا جس کا جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔

جب اُن کی بیٹی کپیلا نے گریجویشن کر لیا تو انھیں اس کی شادی کی فکر دامنگیر ہوگئی۔ اس سلسلے میں انھوں نے افسانہ نگار رام لعل کو بھی ایک خط لکھنؤ میں ایک لڑکے کے بارے میں تحقیقات کرنے اور اپنی رائے دینے کو لکھا تھا۔ رام لعل کو لڑکا پسند آ گیا اور بات پکی ہوگئی اور سلمیٰ سے بھی پوچھا گیا کہ کیا شادی کے بعد لڑکا اس گھر میں بھی آ سکے گا یا نہیں۔ تو سلمیٰ نے جواب دیا تھا'' کیوں نہیں۔ یہ بھی تو ان کا گھر ہے۔ اس طرح سلمیٰ نے بیٹی اور داماد کے لیے گھر کے دروازے وا کر دیے اور پھر شادی دھوم دھام سے دہلی میں کی گئی۔ آج کل اُن کی یہ بیٹی اپنے انجینئر شوہر کے ساتھ بمبئی میں مقیم ہے اور خوش وخرم اپنے شوہر اور بچے کے ساتھ زندگی گزار رہی ہے۔

کرشن چندر کی چھوٹی بیٹی الکا تھی جس کا چند سال پیشتر انتقال ہو گیا ہے۔ اس کی وجہ سے کرشن چندر کو ذہنی اور مالی طور پر پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا کہ جب وہ چھٹی جماعت میں تھی تو اُسے کچھ دماغی بیماری ہوگئی جس کے کارن گھر والوں کو کربناک اور اذیت ناک حالات سے گزرنا پڑا۔ اس کی وجہ سے کرشن چندر کی حالت بھی پاگلوں کی سی ہوئی جا رہی تھی اور دوستوں کو اندیشہ تھا کہ کہیں وہ بھی بیٹی کے بعد پاگل نہ ہو جائیں۔ اس دور کے اپنے بارے میں کرشن چندر نے صہبا لکھنوی مدیر افکار کراچی کو لکھا تھا...... '' ادبی کام بند ہے...... صرف زخمِ دل کھلا ہوا ہے...... مزے آ رہے ہیں''۔ جب بمبئی میں اُس کا خاطر خواہ علاج نہ ہو سکا اور ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ پھر انھیں کسی نے بتایا کہ دہلی کے پاگل خانے میں کوئی نیا علاج امریکہ سے آیا ہے لہٰذا وہ اُسے دہلی لے گئے مگر ڈیڑھ دو مہینے علاج کرانے پر بھی کوئی افاقہ نہ ہوا۔ سب طرف سے نااُمید ہو کر انھوں نے رانچی کے پاگل خانے سے رجوع کیا جنھوں نے اس کی گزشتہ رپورٹیں دیکھنے کا بعد رائے دی کہ اُسے دو مہینے زیرِ تحقیق و تفتیش رکھا جائے گا اور اس کے بعد ہی وہ مستقل علاج سے متعلق اپنا حتمی فیصلہ سنائیں گے، ہو سکتا ہے آپریشن کرنا پڑے۔ لہٰذا

کرشن چندر الکا کو اسپتال والوں کے سپرد کر کے بمبئی چلے گئے۔

جب علاج معالجے کے بعد بچی کو افاقہ نہ ہوا تو انھیں فکر ستانے لگی کہ اُن کی رحلت کے بعد ان کی بیٹی کا کیا ہوگا۔ کون اُس کی دیکھ بھال کرے گا۔ کون مالی خرچ برداشت کرے گا۔؟ لہٰذا بہت سوچ وچار کے بعد اس کی دائمی دیکھ بھال کے لیے انھوں نے اپنے دوست شیام کشن نگم کی سرپرستی میں ایک ٹرسٹ قائم کر دیا تھا مگر اب تو الکا ہی نہیں رہی۔

انھوں نے لاکھوں روپے کمائے مگر انھیں جوڑ کر نہیں رکھا۔ وہ دل کھول کر خرچ کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ فلم بنانے کے دوران اُن کے پاس تین کاریں تھیں جو فلموں کی ناکامی کے بعد بک گئیں۔ اس کے بعد انھوں نے کار نہیں خریدی۔ وہ زیادہ تر ٹیکسی میں سفر کرتے رہے کیوں کہ پیدل چلنا انھیں پسند نہ تھا۔ انھوں نے ٹیکسیوں پر اتنی رقم خرچ کی کہ اس سے وہ کئی کاریں خرید سکتے تھے مگر وہ ٹیکسی پسند کرتے تھے کیونکہ اُن کا کہنا تھا کہ "کون کار چلائے، اُس کے پٹرول پرزوں کا حساب رکھے، ڈرائیور رکھو تو اُس پر چوکسی کون رکھے، میرے لیے ٹیکسی ٹھیک ہے، جب چاہا، بُلا لیا، جب چاہا چھوڑ دیا۔ ڈرائیور کی تیوری کبھی نہیں چڑھی جب بلاؤ مسکراتا ہوا آجاتا ہے۔"

کرشن جی بڑے نفاست پسند تھے۔ وہ خوش لباس ہی نہیں بلکہ لکھنے میں بھی بڑی نفاست برتتے تھے۔ وہ ہمیشہ اعلیٰ کوالٹی کے رائٹنگ پیڈ پر لکھتے تھے اور پین شیفرڈ کا استعمال کرتے تھے جس کا نب باریک ہوتا تھا اور جب لکھنے بیٹھتے تھے تو دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتے۔ چاہے بچے کتنا ہی شور مچا رہے ہوں، انھیں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا اور وہ بڑے تیزی سے لکھتے جاتے تھے اور انھیں دوسرے ادیبوں کی طرح اس میں کاٹ چھانٹ نہیں کرنی پڑتی تھی۔

وہ گھر کے معاملوں میں اُلجھتے نہیں تھے اور اکثر گھر والوں کی ہاں میں ہاں ملاتے تھے۔ وہ جھگڑوں جھمیلوں سے دُور ہی رہنا پسند کرتے تھے۔ وہ پُرسکون زندگی گزارنے اور اطمینان سے لکھنے کی غرض سے اکثر غلط باتیں بھی برداشت کر لیتے تھے۔

لاہور انھیں جانے کی بڑی تمنا تھی اور اکثر وہ لاہور کے دوستوں کو یاد کرتے تھے۔ انھیں بھی لاہور کا ناسٹلجیا تھا۔ لاہور کی یادیں انھیں تڑپاتی تھیں اور وہ پاکستان سے آنے والے دوستوں سے سوال کرتے تھے۔ جب محمد طفیل انھیں ملنے کے لیے آئے تو انھوں نے اُن سے بڑی یاس وحسرت سے پوچھا تھا۔ "کیا اب بھی شام کو ویسی ہی انار کلی میں رونق ہوتی ہے۔ کیا اب بھی شام کو ویسے ہی جوڑے بن سنور کر نکلتے ہیں؟ کیا اب بھی ویسے ہی چائے خانوں میں ادبی موضوعات پر باتیں

ہوتی ہیں۔ کیا اب بھی ویسے ہی.....'' (۱۰)

وہ لاہور جانے کے لیے تڑپتے تھے۔ ایک خط میں انھوں نے محمد طفیل ایڈیٹر نقوش لاہور کو لکھا تھا کہ ''سردیوں میں پاکستان آنے کی سوچ رہا ہوں۔ جب تک امید کرتا ہوں، حالات بہتر ہو جائیں گے۔ ایک بار زندگی کی آخری شاموں میں اپنے دوستوں سے گلے لگ کے باتیں کر لینا چاہتا ہوں۔ انھوں نے مزید لکھا تھا کہ ''لاہور میں رہ کر کوئی شخص بوڑھا نہیں ہو سکتا وہ میرا اسد ابہار جگمگاتا ہوا فانوس بدن شہر اپنی لافانی نوجوانی کے لیے مشہور ہے۔ اس شہر میں رہ کر اگر کوئی شخص بوڑھا ہوتا ہے تو بہتر ہے کہ وہ اس شہر کو چھوڑ دے اور منڈی بہاء الدین، بستی چھپڑاں والا اور چک نمبر چار سو بیس میں سکونت اختیار کر لے۔''

دوسری شادی:

کرشن چندر میں جمالیاتی حس بدرجۂ اُتم موجود تھی اور وہ حسن و جمال کے پرستار اور عاشق مزاج شخص تھے اور انھوں نے زندگی میں کئی عشق کیے مگر سلمیٰ صدیقی سے اُن کا عشق آخری عشق تھا اور اس کے بعد اُن کے دلِ بے قرار کو چین آ گیا اور اپنی بقیہ سترہ سال اُن کی قربت میں ہی گزارے جو اُن کی زندگی کے مسرت افزا اور یادگار دن تھے۔

سلمیٰ صدیقی جو اُردو کے ممتاز ادیب اور مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کے پروفیسر رشید احمد صدیقی کی بیٹی ہیں، کرشن چندر کی نوجوانی سے ہی پرستار تھیں اور وہ اُن کے افسانے بڑے ذوق و شوق سے پڑھتی تھیں اور بقول اُن کے ''صرف وہی نہیں بلکہ شمالی ہندوستان کے ہر اُردو داں گھر میں لڑکیاں بسم اللہ کے گنبد سے نکلتی تھیں تو کرشن چندر پر ایمان لے آتی تھیں''۔

دہلی سے اُن دنوں اس دور کے جانے پہچانے افسانہ نگار شیام سندر پرویزؔ ایک ادبی رسالہ ''شعاعیں'' نکالتے تھے۔ جب انھوں نے لکھنے لکھانے کی جانب رجوع کیا تو پرویز نے انھیں اپنے رسالے کا سب ایڈیٹر بنا دیا۔

ایک بار پرویز کرشن چندر سے کہانی کی استدعا کرنے اُن کے ہاں پہنچے تو انھوں نے اپنا رسالہ کرشن چندر کو پیش کیا۔ اتفاق سے اس رسالے کے ٹائٹل پر سلمیٰ کی تصویر چھپی ہوئی تھی۔ کرشن چندر نے اس تصویر کو دیکھ کر پرویز سے پوچھا۔ یہ لڑکی کون ہے۔ پھر رسالے کے لیے کہانی دیتے ہوئے بولے اچھا یہ لو اسٹوری اور جب میں لکھنؤ آؤں تو مجھے اس لڑکی سے ملوانا لیکن سلمیٰ نے انھیں

لکھنؤ میں نہیں ٹاؤن ہال علی گڑھ میں پہلی بار دیکھا جہاں اُن کا استقبال کیا گیا تھا۔ اس موقع پر سلمیٰ کو اظہار تشکر ادا کرنے کے لیے اسٹیج پر مدعو کیا گیا اور تب انھوں نے اس جلسے میں اقرار کیا کہ وہ اُن کی بہت بڑی پرستار ہیں اور اُن کی کہانیوں سے بے حد متاثر ہیں اور یہ بھی کہا کہ اس دور کی نوجوان نسل ہی نہیں کئی کہانی کار بھی اُن سے متاثر ہیں۔ علاوہ ازیں انھوں کے کئی کہانیوں کا مثبت انداز میں تجزیہ بھی پیش کیا۔ اس کے چند دنوں بعد سلمیٰ جی کو سردار جعفری نے ٹیلی فون کیا اور پوچھا کہ تم نے کرشن کے بارے میں کیا کہا تھا۔ تو انھوں نے وضاحت کی اور بتایا کہ یہ ان کا پہلا اور حقیقی ردِ عمل تھا۔ پھر سردار جعفری نے کہا کہ کرشن چندر تم سے چائے پر ملنا چاہتے ہیں۔

سلمیٰ صدیقی پہلی بار دسمبر کی شدید سردی کے موسم میں اسرار الحق مجاز کے ساتھ اُن سے بھار گو لین دہلی میں ملی تھیں۔ اُس وقت اُن کا ننھا سا بیٹا بھی ان کے ساتھ تھا، اس کے بعد ملاقاتوں کا سلسلہ کسی نہ کسی بہانے چلتا رہا۔

پھر کرشن چندر نے سلمیٰ کو اپنے چھوٹے بھائی اپیندر کی شادی میں مدعو کیا جہاں وہ اُن کے ساتھ ساتھ رہے اور اس کے بعد وہ بار بار ایک دوسرے سے ملتے اور اپنے رومانی سفر کا لطف اُٹھاتے رہے۔

پھر دونوں کا معاشقہ اس مرحلے پر پہنچ جاتا ہے جہاں شادی کے لیے دونوں تیار ہو جاتے ہیں حالاں کہ ان کی شادیوں میں کئی الجھنیں، اڑچنیں اور مسائل تھے۔ پھر سماج کا خوف بھی انھیں اس شادی سے روکتا تھا اور پھر دونوں کو دوسری شادی کرنی تھی اور اس سے پہلے سلمیٰ کے شوہر اور کرشن چندر کی اہلیہ ودیاوتی کی جیتے جی اس طرح کا قدم اُٹھانا اور وہ بھی اس حالت میں جب کہ دونوں کے بچے بھی ہوں، بہت مشکل کام تھا۔ سلمیٰ کا ایک بیٹا تھا اور کرشن جی کے تین بچے۔ ایک بیٹا اور دو بیٹیاں۔ اور سب سے بڑی اڑچن دونوں کا الگ الگ مذہب تھا اس لیے شادی سے پہلے انھیں بہت غور و خوض کرنا پڑا۔ تاہم کرشن چندر تو اتنے دریائے عشق میں ڈوب چکے تھے کہ وہ ہر قیمت پر یہ شادی کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ وہ تو ہر حالت میں اپنی محبوبہ سے شادی کریں گے چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ حالاں کہ انھیں معلوم تھا کہ ہندو دھرم میں پیدا ہونے کی وجہ سے انھیں طلاق نہیں مل سکتی اور پھر اتنے سال بعد اور وہ بھی تین بڑی عمر کے بچوں کے ساتھ؟ اور وہ بھی ودیاوتی کے جیتے جی، سوال ہی نہیں اُٹھتا تھا اور اگر شادی ہو جاتی ہے تو بیویوں کو ایک ساتھ رکھنا بھی ایک مسئلہ تھا۔

شادی سلمٰی بھی چاہتی تھی مگر وہ کرشن چندر کے برعکس زیادہ سنجیدہ ،فکر مند اور خوفزدہ تھی۔ اسے اس معاملے میں کئی مسائل اور اڑچنوں کا سامنا کرنا تھا۔اپنے شوہر سے طلاق لینا تھی، اپنے بچے کو تحویل میں لینے کے لیے جد و جہد کرنی تھی اور پھر ماں باپ اور دیگر رشتہ داروں کی مزاحمت اور مخالفت سے بھی دو چار ہونا تھا۔ بہر حال بالآخر ہمت کر کے دونوں نے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

کرشن چندر نے اپنی پہلی بیوی سے علاحدگی اختیار کر لی اور اُس کی اور اس کے بچوں کی مستقل کفالت کی ذمہ داری قبول کر لی۔ اسی دوران سلمٰی نے بھی اپنے شوہر سے طلاق لے لی اور راستے کی اڑچنیں کچھ حد تک ختم ہو گئیں۔اب سلمٰی کے سامنے سوال تھا اپنے والدین کو رضامند کرنا،تو اس میں غالباً ان کی والدہ نے ہمت دکھائی اور وہ اس شرط پر راضی ہوئیں کہ کرشن چندر اسلام قبول کریں۔ بالآخر معاملہ طے ہو گیا اور جب نینی تال میں اُن کا نکاح ہوا تو وہ اس میں شامل ہوئیں اور نکاح کے بعد انھوں نے بنارس کے دستور کے مطابق سلمٰی کے ماتھے پر بندیا لگائی اور چوں کہ اسلامی دستور کے مطابق نکاح ہونا تھا۔اس لیے مخصوص رشتہ داروں اور دوستوں کی موجودگی میں ۷ رجولائی ۱۹۶۱ءکو نینی تال کے ہوٹل سوئس میں اُن کا نکاح ہوا۔نکاح کے لیے ایک دوست رام پور سے ایک مولوی صاحب اور تین گواہوں کو لے آئے اور بعد نمازِ عصر چند دوستوں کی موجودگی میں طرح طرح کی مذہبی اور سماجی اڑچنوں اور کچھ اعزا و اقارب کی مخالفت کے باوجود نکاح ہو گیا۔نکاح کے بعد چوں کہ نام بدلنا اشد ضروری تھا لہٰذا اُن کا نام اللہ رکھا تجویز کیا گیا مگر کرشن چندر کو یہ گھسا پٹا پرانا نام پسند نہ آیا لہٰذا انھوں نے مولوی صاحب کو نکاح نامے میں اپنا نام وقار ملک لکھوایا کیونکہ پونچھ میں اُن کے دو بچپن کے ساتھی تھے وقار اور ملک۔اُن کے ساتھ اُن کا بڑا اُٹھنا بیٹھنا تھا اور اُن سے اُن کی گہری دوستی تھی۔

شادی کے بعد دونوں نے خوب عیش و عشرت اور سیر و سیاحت کی اور جہاں بھی کرشن چندر گئے وہاں سلمٰی اُن کے ہمراہ تھی۔ گویا انھیں حقیقی جیون ساتھی مل گیا تھا۔وہ مسوری، دہلی بہار، ماسکو لینن گراڈ، سمرقند و بخارا، سرینگر گلمرگ، مختلف مقامات پر زندگی کی رعنائیوں اور لطافتوں کا لطف اُٹھاتے رہے۔

نکاح کے بعد کرشن چندر کوئی دو ماہ تک نینی تال میں مقیم رہے پھر انھوں نے ماڈل ٹاؤن میں ایک مکان کا نچلا حصہ کرائے پر لے لیا۔ یہاں قیام کے دوران کا ایک واقعہ راقم الحروف کے

ایک قریبی بزرگ دوست ڈاکٹر ویشنو داس، مالک مشورہ بک ڈپو نے مجھے سنایا تھا جنھوں نے کرشن چندر کی کئی کتابیں اپنے مکتبہ سے شائع کی تھیں۔ انھوں نے ایک دن بتایا کہ وہ ایک کتاب کے سلسلے میں کرشن چندر سے ملنے ماڈل ٹاؤن گئے تھے لیکن ابھی گفتگو شروع ہوئی ہی تھی کہ دو عورتیں اور ایک مرد گھر میں داخل ہوئے جنھیں دیکھ کر کرشن کے حواس باختہ ہو گئے۔ اُن میں سے ایک اُن کی پہلی بیوی تھیں اور دوسرے کوئی رشتہ دار۔ انھوں نے کرشن چندر سے کہا کہ کہاں ہے تمھاری نئی بیوی ذرا ہم بھی تو دیکھیں۔ اسی دوران سلمیٰ جو غالباً رسوئی میں تھیں، اُن کی آواز سے اسی حالت میں پیچھے سے بھاگ کر مکان کی دوسری منزل پر چلی گئیں۔ حالات کو بگڑتے دیکھ کر کرشن چندر نے ڈاکٹر ویشنو داس سے کہا کہ آپ تشریف لے جائیے کیوں کہ یہ میری پہلی بیوی بمبئی سے آگئی ہے اور ہنگامہ کرے گی۔ اس پر ڈاکٹر ویشنو داس وہاں سے چلے آئے۔ اس کے بعد کیا ہوا انھیں کچھ معلوم نہیں۔

اس شادی کے بعد سلمیٰ صدیقی کرشن چندر کی زندگی کا محور بن گئیں۔ انھیں اُن کے ساتھ اپنی ازدواجی زندگی کے صرف سترہ سال گزارنے کا موقع ملا، ان برسوں میں انھوں نے سلمیٰ کو ہر طرح کا آرام و آسائش فراہم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ انھوں نے ان کی ناز برداری، لاڈ پیار اور دلجوئی میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی اور وہ جتنی بھی خوشیاں انھیں دے سکتے تھے دیں اور اُن کو ایسی مسرت آمیز ازدواجی زندگی سے ہمکنار کیا جس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ کہا جاتا ہے بستر مرگ پر بھی انھیں فکر تھی تو صرف سلمیٰ کی، اس لیے ہر قریبی دوست سے کہتے۔ سلمیٰ کا دھیان رکھنا۔ اس کے لیے میں کچھ نہ کر سکا۔ کبھی سلمیٰ کو کہتے اگر حالات قابو سے باہر ہو جائیں تو پاکستان چلی جانا وہاں میرے بہت سے احباب ہیں جو تمھارا دھیان رکھیں گے اور تمھیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے دیں گے اور سلمیٰ نے بھی انھیں دل و جان سے چاہا اور اپنے کردار و افعال سے ثابت کر دیا کہ وہ اُن کی وفا شعار محبوبہ، خدمت گزار اہلیہ، معتمد صلاح کار اور سب سے قریبی اور مخلص ساتھی اور دوست ساتھی ہیں۔

کرشن چندر سلمیٰ کے والہانہ عشق، پُر خلوص محبت اور پیار کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار رہتے تھے اور نیک نیتی سے ان کی ہر خوشی کو پورا کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ یہاں تک کہ انھوں نے اُن کے بیٹے (منیر) کا بھی پورا دھیان رکھا اور حقیقی باپ کی طرح اس کی پرورش و پرداخت میں دلچسپی لی۔ بعد ازاں یہ لڑکا جوان ہو کر فلم لائن میں چلا گیا اور اُس نے کچھ فلموں کو بھی ڈائرکٹ کیا

مگر افسوس کہ اسے اس جہانِ فانی سے جلد رخصت ہونا پڑا۔

سیر و سیاحت:

۱۹۶۶ء میں کرشن چندر کو سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ سے نوازا گیا۔ جس اعزاز میں پندرہ دن کی سوویت یونین کی سیر و سیاحت کی مراعت بھی شامل تھی۔ کرشن چندر سلمیٰ کے بغیر وہاں جانا نہیں چاہتے تھے لہٰذا انھوں نے روسی سفارت خانے سے اس کی اجازت مانگی، جس کی انھیں منظوری مل گئی اور انھیں سوویت رائٹرز یونین کی طرف سے اپنی بیوی سلمیٰ صدیقی کے ہمراہ آنے کا دعوت نامہ مل گیا اور وہ سلمیٰ کے ساتھ مئی ۱۹۶۷ء میں کریملن میں روس کی چوتھی ادبی کانگریس میں شرکت کے لیے تشریف لے گئے جس میں چین کے علاوہ بہت سے دیگر ممالک کے مندوبین نے شرکت کی تھی۔ ہندوستان سے اس کانفرنس میں اُردو، ہندی، گجراتی، آسامی، تیلگو، تمل، کنڑ اور اُڑیا وغیرہ کے برگزیدہ ادیب شامل ہوئے تھے۔ پاکستان سے فیض احمد فیض بھی شریک ہوئے۔ یہ کانفرنس کئی دن چلتی رہی۔

کہا جاتا ہے کہ جب انھیں ہرونش رائے بچن کے ساتھ یہ ایوارڈ دیا گیا تو اُس تقریب میں جواہر لال نہرو بھی موجود تھے مگر انھوں نے ہرونش رائے بچن، تیجی بچن سے تو ہاتھ ملایا لیکن کرشن چندر کو مبارک باد دینے اور ان سے مصافحہ کرنے سے گریز کیا اور کرشن چندر بھی ہاتھ ملانے کے لیے آگے نہ بڑھے۔ شاید نہرو جی کرشن چندر کی شہرت یافتہ کتاب ''ایک گدھے کی سرگزشت'' سے ناخوش تھے جس میں نوکر شاہی اور سیاسی حالات پر طنز کیا گیا تھا۔ اتفاقاً ارونا آصف علی نے یہ دیکھ لیا اور نہرو جی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''کیوں جواہر تم انھیں نہیں جانتے''۔ نہرو جی نے کرشن چندر کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔ ''ہاں جانتا ہوں یہ وہی ہیں جنھوں نے گدھے کی کہانی لکھی ہے'' اس سے معلوم ہوتا ہے انھیں کرشن چندر کی یہ کتاب پسند نہیں آئی مگر اُن دونوں میں ذاتی رنجش ہونے کا بھی کہیں کوئی ذکر نہیں اور اُن کی بیٹی اندرا گاندھی سے تو کرشن چندر کے بہت اچھے ذاتی تعلقات تھے حتیٰ کہ کرشن چندر نے ایمرجنسی عائد کرنے میں انھیں حق بجانب ٹھہرایا تھا اور اُن کی تعریف کی تھی جس پر بہت سے ادبا و شعرا نے اُن پر حرف زنی کی تھی اور اُن کے اس موقف کی مخالفت کی تھی۔

ماسکو کانفرنس کے دوران کرشن چندر اور فیض احمد فیض کا قیام ہوٹل ماسکو میں رہا مگر انھیں

ایک دوسرے سے ملنے کا موقع تاخیر سے ملا۔ شام کو جب اسی ہوٹل ماسکو کے وسیع ڈائننگ ہال میں سبھی ممالک کے مندوبین اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھے تھے اور اُن کی میزوں پر اُن کے ممالک کے چھوٹے چھوٹے جھنڈے لہرا رہے تھے جن کی وہ نمائندگی کر رہے تھےمگر پاکستان کا جھنڈا اور فیض صاحب کہیں دکھائی نہ دیے۔ استفسار پر معلوم ہوا کہ اُن کی میز اور فیض صاحب کی میز کے بیچ کوئی تیس میزوں کا فاصلہ ہے۔

اس کانفرنس میں دنیا کے بین الاقوامی شہرت کے مالک متعدد اشتراکی دانشوروں اور ادیبوں نے حصہ لیا تھا جن میں چلی کے شاعر پابلو نرودا، انگریز ادیب لارڈ سنوڈن، جرمن ادیبہ اینا سیگھرز، افریقی شاعر ایلکسی لگونا، روس کے عالمی شہرت یافتہ ادیب شولوخوف، ڈیلیا آہیرن برگ، رسول گمزادوے، ترسون زادے فیدن خاص طور پر قابل ذکر ہیں مگر ان مشاہیر میں کرشن چندر کی نظریں تو فیض صاحب کو تلاش کر رہی تھیں کہ اچانک فیض برآمدے سے ڈائننگ ہال کی جانب بڑھتے نظر آئے۔ وہ چاروں طرف نظر دوڑا کر کسی کی تلاش میں تھے۔ پھر کرشن چندر اور فیض کی نظریں ملیں اور دونوں اپنے اپنے ملکوں کے جھنڈے لیے ایک دوسرے کی طرف بڑھے اور پھر دونوں ایک خالی میز پر اپنے اپنے جھنڈے لگا کر ایک دوسرے سے گلے ملنے لگے۔ اس روح افزا یادگار منظر کو دیکھ کر سبھی ممالک کے نمائندے تالیاں بجانے لگے جس کی گونج اُس وقت تک جاری رہی جب تک وہ لوگ میز پر بیٹھ نہیں گئے اور یہ تالیاں اس لیے بھی تھیں کہ کوئی ڈیڑھ دو سال پہلے ۱۹۶۵ء میں دونوں کے ملکوں میں زبردست جنگ ہوئی تھی اور دونوں ملکوں کے تعلقات کشیدہ تھے اور یہ دونوں دوست اپنے ملکوں کے عوام کے برعکس بغض و عناد کے بجائے ایک دوسرے سے مل کر محبت، ہم آہنگی و یگانگت کا اظہار کر رہے تھے۔ اس دورے کے دوران ان کی کئی غیر ملکی ادیبوں اور دانشوروں سے ملاقات ہوئی جن میں روس کے ممتاز عالمی شہرت یافتہ ناول نویس شولوخوف بھی شامل تھے جن کے ناول 'And Quiet Flows the Don' نے دنیا بھر میں بڑی شہرت حاصل کی تھی۔ اس کے علاوہ انھوں نے ٹالسٹائی کا گھر اور میوزیم بھی دیکھا جہاں وہ ایک مدت تک رہائش پذیر رہے اور کئی شہرۂ آفاق ناولوں کی تخلیق کی۔ ماسکو میں اُن کی فیض سے بھی بڑی گرم جوش ملاقاتیں رہیں اور جب وہ وہاں سے وداع ہوئے تو کرشن چندر نے بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ "یہ جدائی عارضی ہے۔ دوست ہم پھر ملیں گے۔" مگر دوبارہ ملنے کا انھیں موقع نہ مل سکا اور جب وہ ۱۹۷۱ء میں پانچویں کانفرنس میں شرکت کے لیے گئے تو

بوجوہ فیض اس میں شرکت نہ کر سکے اور چوتھی کانفرنس اُن کی آخری ملاقات بن کر رہ گئی۔

ماہ اگست میں وہ سلمٰی کے ساتھ ہنگری کی سیر و سیاحت کے لیے گئے۔ بوڈاپسٹ کے ہوائی اڈے پر اُن کا پُرتپاک استقبال ایلڈی نے کیا جو کہ وہاں کی یونیورسٹی میں ہندی کی اُستاد تھیں اور کرشن چندر اور سلمٰی سے ہندوستان میں ایک سال کے قیام کے دوران کئی بار مل چکی تھیں۔ ایلڈی نے انھیں بوڈاپسٹ میں ہر قابلِ دید مقام کی سیر کرائی۔ وہاں انھوں نے لینن اسکوائر اور روز ویلٹ اسکوائر کو بھی دیکھا۔ انھوں نے وہاں کا پبلک اسٹیڈیم بھی دیکھا جس میں اسی ہزار افراد بیٹھ کر پروگراموں سے لطف اندوز ہو سکتے تھے۔ انھوں نے کامیڈی تھیٹر کے علاوہ ایک ہی سڑک پر کئی تھیٹر دیکھے جو اس بات کا بین ثبوت ہے کہ ہنگری کے عوام تھیٹر کے بڑے دلدادہ ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جس دن ہنگری کی عورتوں کو تھیٹر جانا ہوتا ہے اُس دن وہ خوب بجتی سنورتی ہیں اور عمدہ لباس اور خوشبو میں بسی وہاں جاتی ہیں اور پروگرام سے لطف اندوز ہوتی ہیں۔ انھوں نے کارل مارکس یونیورسٹی دیکھی جو ملک کی مشہور درس گاہوں میں سے ایک ہے اور جہاں ہزاروں طلبا تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اور انھیں سب سے زیادہ 'بوری وار' نامی مقام پسند آیا جو شہر کے مشرقی حصے میں ایک قلعہ نما عمارت ہے اور جسے مشہور مصور، مجسمہ ساز اور مدرس جیا بورنی نے اپنی محبوب اہلیہ کے لیے اپنی زندگی کا سارا اثاثہ خرچ کر کے بنوایا تھا اور اس کی محراب دار دیواریں اُس کی بیوی کی تصاویر اور قد آدم مجسموں سے آراستہ تھیں۔ اُس زمانے میں جیا بورنی کی وفات ہو چکی تھی مگر اس کی بیوی زندہ تھی اور اس وقت بڑھاپے کی منزل طے کر رہی تھے۔ اُس نے سلمٰی کو گلے لگایا اور بہت پیار کیا۔ کرشن چندر اُس بوڑھی خاتون کو حیرت و استعجاب سے دیکھتے رہے کہ ایک معمولی عورت کے لیے ایک معمولی آدمی نے اتنا بڑا محل بنا دیا۔ انھیں دیکھ کر کرشن چندر کو احساس ہوتا تھا کہ وہ اپنی جوانی کے دور میں ضرور حسین رہی ہوگی مگر اتنی بھی نہیں کہ کوئی اس پر جان نچھاور کر دیتا یا شاہجہاں کی طرح اُس کے لیے تاج محل تعمیر کروا دیتا۔

کرشن چندر اور سلمٰی نے بالاٹون جھیل کا وہ علاقہ بھی دیکھا جہاں دُور دراز علاقوں اور یورپ کے ممالک سے سیاح کھچے کھچے چلے آتے ہیں اور اس جھیل سے لطف اندوز ہوتے ہیں جس کے کنارے دور دور تک سیلانیوں کے لیے ہوٹل، ریستوراں اور ریسٹ ہاؤس بنے ہوئے ہیں۔ اسی کے قریب ہی بالاٹون فیوڈ سیر گاہ ہے جہاں کے صحت بخش پانی کے چشموں میں نہانے اور پانی پینے لوگ دور دراز سے آتے ہیں۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے۔ یہاں ۱۹۲۶ء میں گرودیو رابندر ناتھ

ٹیگور سیر و سیاحت اور بحالی صحت کی غرض سے اور پھر کئی دہوں بعد پنجابی کی معروف شاعرہ اور فکشن نگار امرتا پریتم بھی تشریف لائی تھیں۔ گرو دیو نے اپنے قیام کے دوران یہاں لنڈین کا ایک پیڑ بھی لگایا تھا اور اب اس کے نیچے اُن کا مجسمہ بھی لگا ہوا ہے اور اس کے نیچے اُن کی نظم کے درج ذیل سطور کندہ ہیں اور نیچے ۸ نومبر ۱۹۲۶ء کی تاریخ لکھی ہوئی ہے:

''میں جب اس زمین پر نہیں ہوں گا
اُس وقت بھی میرا یہ پیڑ تمھاری بہار کو نئے پتے دے گا
اور راہ چلتے سیاحوں کو کہے گا
کہ ایک شاعر نے اس سرزمین سے پیار کیا تھا......''

اب اس جگہ کا نام ٹیگور ایونیو ہے اور آٹھ سو میٹر طویل ہے جو دورویہ درختوں کی قطار سے گھرا ہوا ہے اور جھیل کے کنارے واقع مشہور ہوٹل ولا تک پھیلا ہوا ہے۔

بوڈاپسٹ میں قیام کے دوران کرشن چندر نے یوں تو کئی قابل دید جگہیں، سیر گاہیں، باغات اور جھیلیں دیکھیں مگر اُن کی خواہش تھی کہ وہ اس ملک کے کسی تھیٹر میں کوئی ڈراما دیکھیں کیونکہ انھیں ڈرامے دیکھنے کا بے حد شوق تھا اور خود ڈرامے لکھنے کے علاوہ لڑکپن میں انھوں نے کچھ ڈراموں میں رول بھی کیے تھے۔ اتفاق سے اُن دنوں کا جی میر کا شہرہ آفاق ڈراما ''رامائن'' چل رہا تھا اور اس پر رش کی یہ حالت تھی کہ اگست میں ہی نومبر تک کی سیٹیں محفوظ ہو چکی تھیں۔ بہر حال اُن کی میزبان ایلڈی نے کوشش کر کے کسی نہ کسی طرح تین ٹکٹ حاصل کر لیے۔ کرشن چندر اور سلمیٰ کو اگلی صف میں بٹھایا گیا اور لوگ اُن کی جانب دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے تھے کہ وہ رامائن کے دیس سے آئے ہیں۔

ڈرامے میں کچھ چیزیں انوکھی اور دلچسپ دیکھنے کو ملیں۔ ڈرامے کی شروعات ''پربھات فلم کمپنی'' کی مشہور فلم ''رام راجیہ'' کے مقبول گیت ''بھارت کی اِک ناری کی ہم کتھا سناتے ہیں'' سے کی گئی تھی جس کی موسیقی نے مسحور کن فضا پیدا کر دی تھی اور پردیس میں اپنے وطن کی زبان کا یہ گیت سُن کر کرشن چندر پر رقت طاری ہو گئی۔ اس ڈرامے میں انوکھی اور عجیب چیزیں دیکھنے کو ملیں۔ جیسے سیتا کو ہندوستانی لباس میں پیش کیا گیا لیکن اس کے برعکس رام کو واسکٹ اور پینٹ میں دکھایا گیا تھا۔ رات کے منظر میں کٹیا میں لالٹین کی روشنی کی گئی۔ بن باس میں جنگل کا منظر سوکھی لکڑیوں سے بنایا گیا تھا۔ تھیٹر کی چھت کسی سرکس کے شامیانے سے مشابہ تھی جس میں ہنومان

ادھر اُدھر کودتے اُچھلتے دکھائے گئے تھے۔

یہ ڈراما تین گھنٹے جاری رہا اور حاضرین نے اسے بڑے ذوق وشوق سے دیکھا۔ اس میں کئی مقام پر نئی تکنیک کا استعمال کر کے اسے جدت طرازی کا نمونہ بنایا گیا تھا اور اس نے حاضرین کو اپنے سحر میں باندھے رکھا اور کہیں بھی کسی کو کوئی اُکتاہٹ محسوس نہیں ہوئی۔ ڈرامے کے خاتمے پر تھیٹر کا ہال سات منٹ تک تالیوں سے گونجتا رہا اور اداکار پردے سے باہر کھڑے ہو کر دادِ تحسین پاتے رہے۔ پھر کرشن چندر اور سلمیٰ کی جانب دیکھتے ہوئے بھی تالیاں بجائی گئیں جن کا جواب انھوں نے بھی کھڑے ہو کر اور ہاتھ جوڑ کر دیا اور یہ سب ہندوستان کے احترام وتوقیر کا مظہر تھا کہ وہ لوگ ہندوستان سے کتنا پیار کرتے ہیں۔

خیالات ونظریات:

کرشن چندر کا بچپن چوں کہ پونچھ، کشمیر میں گزرا اس لیے وہ بچپن سے ہی فطرت کے گرویدہ تھے۔ انھوں نے اُس دور میں سردیوں میں برف باری سے لے کر موسمِ بہار میں کھلتے رنگ برنگے پھولوں تک کی گوناگوں کیفیات کا بڑے قریب سے مطالعہ کیا تھا۔ فطرت کے بعد انھیں سائنس میں رغبت رہی تھی اور اسی سائنس کے مطالعہ نے ہی انھیں مذہبی ہونے سے بچالیا اور سائنس نے انھیں کئی اوہام سے بھی نجات دلادی۔ فطرت اور سائنس کے بعد اُن کی زندگی میں نئی تبدیلی اشتراکیت کی بدولت آئی اور اشتراکیت نے انھیں اتنا متاثر کیا کہ وہ اُن کے بنیادی عقائد کا مرکز بن گئی۔

وہ گاندھی جی کے خیالات سے پوری طرح اتفاق نہیں کرتے تھے لیکن وہ اُن کی بعض باتوں کو پسند بھی کرتے تھے۔ وہ اُن کی سادہ زندگی، سادگی اور عوامی خدمت کے جذبے کے معتقد تھے اور اُن کی رہبری ورہنمائی کے قائل تھے کہ اُن کے قول وفعل میں کوئی تضاد نہیں تھا۔

عادات وخصائل:

اُن کی عادات کے بارے میں سلمیٰ کا کہنا تھا کہ ''عید کے دن بے حد خشوع وخضوع سے نئے کپڑے پہنتے، عطر لگاتے، پان پہ پان کھاتے اور ہر تھوڑی دیر کے بعد شیر قورمہ چکھ لیتے اور بار بار عید کے بہانے گلے لگنے اور لگانے کے بہانے ڈھونڈتے رہتے۔''

کرشن چندر ابتدا میں مے نوشی سے پرہیز کرتے تھے۔ بعد ازاں جب منٹو اُن کے ہاں دہلی میں قیام پذیر ہوئے تو انھوں نے انھیں یہ لت ڈال دی۔ کہا جاتا ہے کہ جب منٹو پہلی بار بمبئی سے ریڈیو جوائن کرنے کے لیے دہلی آئے تھے تو انھوں نے کرشن چندر کی قیام گاہ بھار گولین تیس ہزاری میں قیام کیا تھا اور پہلے ہی دن انھوں نے سولن وہسکی کی بوتل کھولی اور خود تو پی ہی انھیں بھی پلا دی اور پھر انھیں بھی مے نوشی کی عادت پڑ گئی۔ اپنی اس مے نوشی کی شروعات کے بارے میں کرشن چندر نے لکھا ہے کہ کس طرح منٹو نے انھیں پلائی:

> ''لو شراب پیو......'' یہ کہہ کر منٹو نے چھوٹے کوٹ کی جیب سے ایک بوتل نکالی۔ سولن وہسکی نمبر ا۔ اور اس کا کاگ اُڑا کر بولا ''لو۔ جلدی سے لو۔ گلاس منگواؤ۔ دیر ہو رہی ہے۔''
>
> اب تک میں نے کبھی شراب نہ چکھی تھی لیکن منٹو کا چہرہ اس قدر درشت تھا۔ اُس کا لہجہ اس قدر تند تھا کہ میں نے سوچا اگر میں نے انکار کر دیا تو کہیں وہ مجھے مار ہی نہ بیٹھے۔ میں نے نہایت اطمینان سے دو گلاس منگوائے۔ منٹو نے شراب انڈیلنی شروع کی۔ پوچھنے لگا تم کون سی شراب پیتے ہو؟...... میں تو پہلے ہی پیگ میں نہال ہو گیا تھا۔ اس کے بعد دوسرا میں نے نہیں لیا اور نہ منٹو نے اصرار کیا کیونکہ وہ میری حالت دیکھ چکا تھا۔ میں نے اقبال کیا کہ یہ پہلی بار پی رہا ہوں۔ اس پر منٹو نے شراب کے فائدے گنائے۔ گناہ کی لذت شراب میں ہے، عورت کی رنگت شراب میں ہے۔ ادب کی چاشنی شراب میں ہے۔ مکروہات دنیا سے نجات شراب میں ہے۔ بھئی تم کب تک پنڈت بنے رہو گے؟ آخر تمھیں ادب کی تخلیق کرنا ہے۔ کوئی اسکول کے بچوں کو تو پڑھانا ہے نہیں۔ زندگی نہیں دیکھو گے۔ گناہ نہیں کرو گے۔ موت کے قریب نہیں جاؤ گے۔ غم کا مزا نہیں چکھو گے۔ سولن وہسکی نمبر ا نہیں پیو گے تو کیا تم خاک لکھو گے؟'' (۱۱)

کرشن چندر اعلیٰ درجے کی ہی وہسکی پیتے تھے اور یہ رات کے کھانے کا ضروری حصہ تھی۔ عام طور پر وہ تین چار ہی پیگ تک اپنے آپ کو محدود رکھتے تھے اور اگر کبھی کبھار اس سے زیادہ پی جائیں تو وہ بہکتے نہیں تھے۔ اُن کے حوش و ہواس قائم رہتے تھے بلکہ پی کر سنجیدہ ہو جاتے

تھے مگر کسی طرح کی بدتمیزی نہیں کرتے تھے جیسا کہ بعض شرابی کیا کرتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ کرشن چندر نے آخری بار شراب نوشی وفات سے کوئی ایک سال پیشتر کی تھی جب انھوں نے اپنے دوستوں کو ایک شاندار دعوت دی تھی۔ اُس رات انھوں نے پانچ بڑے پیگ پیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسی رات انھیں تیسرا جان لیوا ہارٹ اٹیک ہوا۔

کرشن چندر سے جو بھی ملتا تھا ان کی تعریف ہی کرتا تھا۔ وہ بہت مہمان نواز، منکسر مزاج، کشادہ دل، خوش لباس، گداز دل، خوش مذاق، حسن پرست اور عاشق مزاج شخصیت تھے۔ وہ یاروں کے یار تھے اور ہر گھر آنے والے کا کھلے دل سے سواگت کرتے تھے اور اکثر بمبئی آنے والے دوست اور جانکار اُن کے ہاں ہی قیام کرتے تھے۔

عظمتِ کرشن چندر:

ماہنامہ ادبی دنیا کے مدیر مولانا صلاح الدین اُس دور کی ایک ممتاز ادبی شخصیت تھے جن کے ارد گرد ادیبوں اور شاعروں کا مجمع لگا رہتا تھا اور ہر کوئی ان کی خوشنودی کے لیے کوشاں رہتا۔ لیکن کرشن چندر اُن کے منظور نظر تھے اور اُن کے ابتدائی ادبی دور سے ہی وہ اُن کے چہیتے افسانہ نگار تھے اور جب اُن کا پہلا افسانہ 'یرقان' اُن کے رسالے میں شائع ہوا تو اُس پر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے تحریر کیا تھا کہ " اس افسانے کا شمار دنیا کے بہترین افسانوں میں کیا جاسکتا ہے۔" اور ماہنامہ 'ہمایوں' کے مدیر میاں بشیر احمد نے بھی اُن کی تعریف کے پُل باندھتے ہوئے پیش گوئی کی تھی کہ " عمر اور تجربے کی کچھ منزلیں طے کرنے کے بعد یہ شخص اُردو کا مایہ ناز ادیب ثابت ہوگا۔"

اور کنہیا لال کپور تو اُن کے افسانوں کے معتقد تھے اور وہ اس میدان میں ان کی حوصلہ افزائی بھی کرتے تھے لہٰذا اُن کے اولین افسانوی مجموعے "طلسمِ خیال" کی اشاعت پر لاہور کے مشہور انگریزی روزنامے 'ٹریبون' (The Tribune) میں تبصرہ کرتے ہوئے پیشین گوئی کی تھی کہ " اس کتاب کے مصنف کا شمار کسی روز دنیا کے صفِ اول کے افسانہ نگاروں میں ہوگا۔"

سلمیٰ نے ایک بار ایک انٹرویو میں بتایا تھا کہ کرشن جب کہانی لکھتے تھے تو وہ اُس میں پوری طرح مستغرق ہو جاتے تھے اور جس طرح کی وہ کہانی لکھتے تھے اسی طرح کے تاثرات اُن کے چہرے سے ظاہر ہوتے تھے۔ ایک بار وہ بہت دیر کمرے میں بند کہانی لکھ رہے تھے تو میں نے

اسٹول پر چڑھ کر (روشندان سے) اندر دیکھا تو خوف زدہ سی ہوگئی۔ کیونکہ اس سے پیشتر میں نے اُن کا یہ چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ کیونکہ اس وقت اُن کے چہرے سے کربناکی اور نفرت مترشح تھی جو اُن کے کرداروں میں پائی جاتی تھی۔ بعد میں میں نے دیکھا کہ وہ اُس وقت ''آدھے گھنٹے کا خدا'' نامی کہانی لکھ رہے تھے۔ کرشن چندر کا کہنا تھا کہ ہر کہانی اُن پر سے گزرتی ہے۔

کرشن چندر پر ڈاکومنٹری:

کرشن چندر کی وفات سے کوئی چار سال پیشتر مرکزی حکومت کی وزارت اطلاعات و نشریات نے اُن کی قد آور اور عالمی شہرت کے پیشِ نظر اُن پر ایک بیس منٹ کی ڈاکومنٹری بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کام کو سرانجام دینے کے لیے مہندر ناتھ کو منتخب کیا گیا اور اس کی شوٹنگ ممبئ اور پونے کے علاوہ کشمیر میں بھی کی گئی جہاں کرشن چندر نے اپنا بچپن لڑکپن گزارنے کے بعد جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تھا اور جہاں کی یادیں وہ کبھی نہ بھلا سکے۔

اس مقصد کے لیے بائیس افراد کی فہرست تیار کی گئی جو اس سلسلے میں اُن کے ہمراہ پونچھ اور مہندڑ گئے۔ ان میں کرشن چندر، مہندر ناتھ، فلم ہدایت کار، کیمرہ مین کپور اور دیگر معاونین کے علاوہ اُن کی اہلیہ سلمٰی صدیقی، بہن سرلا دیوی، مہندر ناتھ کی بیوی درگا دیوی اور کچھ دیگر اعزا و اقارب بھی شامل تھے۔ جموں ریلوے اسٹیشن پر اُن کا استقبال حکومتِ جموں و کشمیر کی طرف سے غلام رسول ریز نے کیا جو کہ کرشن چندر کے پرانے دوست تھے اور جن کے سپرد ریاستی حکومت نے طعام و قیام کا اہتمام کر رکھا تھا، جموں میں ایک دن کی شوٹنگ کے بعد سارا قافلہ پونچھ کے لیے روانہ ہوگیا۔

پونچھ پہنچنے پر اُن کا پُر جوش استقبال وہاں کے ڈپٹی کمشنر غلام نبی نائیک، سپرنٹنڈنٹ پولیس، سرکاری عملہ اور وہاں کے سرکردہ شہریوں نے کیا اور وہاں انھیں نئے اور پرانے بنگلے میں ٹھہرایا گیا۔ وہاں قیام کے دوران اُن کے بچپن کی یادوں سے وابستہ جگہوں پر شوٹنگ کی گئی جن میں وہ گھر بھی شامل تھا جہاں انھوں نے اپنی ماں، باؤ جی اور بھائی مہندر ناتھ کے ساتھ اپنا بچپن گزارا تھا۔

شوٹنگ کے اختتام پر اہلِ پونچھ اُن کا پُر جوش خیر مقدم کرنے کی غرض سے اُن کو جلوس کی شکل میں گیتا بھون لے گئے اور وہاں انھیں خراج تحسین پیش کرنے کے لیے اُن کے اعزاز میں

ایک جلسہ کیا گیا، جس کے جواب میں کرشن چندر نے اُن کا بڑے جذباتی انداز میں شکریہ ادا کیا۔ مذکورہ جلسے میں اُن کے علاوہ مہندر ناتھ اور سلمٰی نے بھی تقاریر کیں اور کرشن چندر کے اسکول کے اُستاد ماسٹر دینا ناتھ شوقؔ نے اس موقع پر انھیں منظوم خراج تحسین پیش کیا۔

کشمیر میں اس قافلے کا کوئی ایک مہینہ قیام رہا اور اس کے بعد یہ لوگ واپس بمبئی آ گئے۔ اور چھ ہزار فٹ بنائی گئی ڈاکومنٹری کی کاٹ چھانٹ کر کے صرف ایک ہزار نو سو فٹ کر دی گئی جو کرشن چندر کی زندگی کے کئی پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہے۔

انتقال

کرشن چندر کو چار بار ہارٹ اٹیک ہوا۔ پہلی بار انھیں ۲۳ رنومبر ۱۹۶۷ء کو کھار میں واقع اپنی رہائش گاہ ''گورو نواس'' پر اس جان لیوا بیماری سے سابقہ پڑا۔ خبر سُن کر سب کو بڑی فکر و تشویش ہوئی اور دہلی سے اُن کی والدہ، بہن سرلا دیوی، بہنوئی ریوتی سرن شرما اور اُن کے چھوٹے بھائی اپیندر ناتھ بھی بمبئی کے لیے روانہ ہو گئے مگر دورۂ قلب اتنا شدید نہیں تھا اور اپنے گھر پر ہی معروف ماہر امراض قلب ڈاکٹر وکیل کے زیرِ علاج رہے اور شب و روز دو نرسیں اُن کی دیکھ بھال اور نگرانی کے لیے رکھی گئیں۔ اس کے ساتھ ہی آکسیجن اور دیگر ضروری ساز و سامان کا بھی اہتمام کر دیا گیا تھا اور آخر اڑھائی تین ماہ کے علاج معالجہ اور مکمل آرام کے بعد وہ روبصحت ہو کر پھر زندگی کے معمولات میں مصروف ہو گئے۔ گھر کے سبھی افراد دہلی واپس آ گئے لیکن بمبئی سے آنے کے بعد کرشن جی کی والدہ نے دوا لینی بند کر دی۔ جب اُن کے چھوٹے بھائی اپیندر نے اُن سے پوچھا کہ آپ نے دوا لینی کیوں بند کر دی تو انھوں نے جواب دیا کہ اب مجھے کسی بچے کی وفات برداشت کرنے کی ہمت نہیں کیونکہ اس سے پیشتر اُن کی بڑی بیٹی کینسر سے اور دو بھائی حادثے میں جاں بحق ہو چکے تھے۔ کرشن جی کو دل کا دوسرا دورہ ۱۹ مارچ ۱۹۶۹ء کو ''نش'' میں ہوا اور انھیں اسپتال میں منتقل کیا گیا۔ اُن دنوں اُن کے چھوٹے بھائی اُپیندر بمبئی میں ہی تھے اور وہ لگ بھگ ڈیڑھ مہینہ وہاں رہے اور جب وہ روبصحت ہو گئے تو وہ واپس دہلی آ گئے۔

۱۸ رمارچ ۱۹۶۹ء کو ڈاکٹر رفیق زکریا کے زیر صدارت کرشن چندر کا پچپن سالہ جشن بڑی شان و شوکت سے منایا گیا جس میں شرکت کے لیے اُس وقت کی وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی خصوصی طور پر دہلی سے تشریف لائیں اور انھیں خراج تحسین پیش کیا مگر افسوس کہ دوسرے دن

۱۹ رمارچ کو رات ساڑھے چار بجے اچانک کرشن چندر کو دوسری بار دل کا دورہ پڑ گیا۔ جس سے سب کو اُن کے بارے میں چنتا ہونے لگی۔

اُن کی طبیعت شدید بگڑ جانے کی خبر سُن کر مہاراشٹر کے وزیر ڈاکٹر رفیق زکریا کئی ماہرین امراضِ قلب کے ہمراہ اُن کے ہاں پہنچے۔ ڈاکٹروں نے اُن کی طبیعت شدید تشویشناک بتائی اور انھیں اسپتال منتقل کرنے کا مشورہ دیا مگر جب وہ انھیں لے جانے لگے تو سلمیٰ رونے لگیں اور انھوں نے انھیں ایسا کرنے نہیں دیا اور کہا کہ پہلی بار کی طرح اس بار بھی اُن کا علاج گھر پر ہی کرنے کا انتظام کیا جائے لہٰذا ارادہ بدل دیا گیا اور اُن کے علاج معالجے کا اہتمام گھر پر ہی کر دیا گیا اور ڈیڑھ دو مہینے تک علاج کے باوجود اُن کی حالت تشویشناک ہی رہی حالانکہ اس دوران انھیں باقاعدگی سے آکسیجن دی جاتی رہی اور انھیں چار ڈاکٹروں کی سخت نگرانی میں رکھا گیا اور کسی کو اُن سے ملنے کی اجازت نہ دی گئی۔ صرف دو اصحاب کو ہی ایک دن میں اُن سے ملنے کی اجازت تھی۔ بالآخر وہ روبصحت ہو کر اُٹھنے بیٹھنے لگے۔ پہلے وہ گھر کے باہر کی سڑک تک ہی سیر کے لیے جاتے رہے پھر بمبئی شہر بھی جانے لگے اور پھر معمول کے مطابق زندگی بسر کرنے لگے۔

کرشن جی کی بیماری نے گھر بھر کو ہلا دیا تھا اور ان کی والدہ کو تو اُن کی بہت فکر و تشویش رہنے لگی۔ نتیجتاً انھیں بھی دل کا دورہ پڑا اور وہ راہیِ ملکِ عدم ہو گئیں۔ اس کے دو سال بعد ۱۹۷۴ء میں اُن کے بہت ہی عزیز بھائی اور بچپن کے ساتھی مہندر ناتھ کی جنھیں وہ بے حد چاہتے تھے دل کے شدید دورے سے وفات ہو گئی جس کا انھیں انتہائی صدمہ پہنچا۔

تیسرا دورہ انھیں ۷ ۲ رجولائی ۱۹۷۶ء کی رات کو لگ بھگ ساڑھے چار بجے پڑا۔ وہ اُس دن رات گئے دوستوں کے ساتھ مے نوشی اور شراب کی محفل کا لطف اُٹھاتے رہے بلکہ سونے سے پیشتر انھوں نے سلمیٰ کو تاکید کر دی کہ بچا ہوا سارا کھانا نوکروں میں مت بانٹ دینا بلکہ تھوڑے سے کباب اور بریانی اُن کے ناشتے کے لیے بھی محفوظ رکھ لینا میں صبح کو یہی ناشتہ کروں گا مگر رات ساڑھے چار بجے کے قریب اُن کا یکلخت دم گھٹنے لگا جس پر انھوں نے اپنے فیملی ڈاکٹر کو بتایا کہ انھیں دل کا دورہ پڑا ہے، لہٰذا وہ فوراً آئیں۔ فون پر کرشن چندر کو بات کرتے سُن کر سلمیٰ بھی جاگ اُٹھیں اور پندرہ منٹ میں اُن کے فیملی ڈاکٹر کے ایل سہگل بھی پہنچ گئے اور انھوں نے کرشن چندر کو انجکشن لگایا جس سے وہ جلد ہی سو گئے اور ڈاکٹر ای سی جی کرانے کی ہدایت دے کر چلے۔ دوسرے دن شیام کشن نگم، راہی معصوم رضا، علی سردار جعفری اور مجروح سلطان پوری جو رات کے

کھانے کی دعوت میں شامل تھے اطلاع دی گئی اور وہ عیادت کے لیے پہنچ گئے۔ اس دوران اُن کا بیٹا رنجن بھی اطلاع ملنے پر پہنچ گیا۔ ماہرین امراضِ قلب بھی آئے اور ای سی جی لیا گیا۔ پھر سردار جعفری اس مرض کے اسپیشلسٹ ڈاکٹر گوئیل کو لے آئے جنھوں نے ای سی جی کرنے کے بعد اظہار تشویش کرتے ہوئے انھیں فوراً اسپتال منتقل کرنے کی ہدیت کی۔ لہٰذا ایمبولنس بلا کر انھیں اسپتال کے آئی سی یو کمرہ نمبر ۳۱۶ میں داخل کر دیا گیا اور ان کے دائیں جانب ایک مشین سی لگا دی گئی اور وہ آرام سے سو گئے۔ پھر صبح کوئی چھ بجے کے قریب اُن کی نیند کھل گئی اور انھوں نے نرس سے چائے کا تقاضا کیا تو نرس نے کہا کہ چائے سات بجے ملے گی۔ پھر کچھ ہی دیر بعد اچانک مشین میں لگا خطرے کا الارم بج اُٹھا اور اس کے دونوں طرف خطرے کی روشنیاں چمک رہی تھیں جس پر بھگدڑ سی مچ گئی اور ڈاکٹر اور نرسیں فوراً پہنچ گئے اور انھیں اسٹریچر پر لٹا کر آپریشن روم میں لے گئے اور انھیں پیس میکر فٹ کر دیا گیا۔

دراصل گھر میں ہونے والی اموات نے کرشن جی کو گہرا صدمہ پہنچایا تھا۔ مہندر جی اور سرلا کی موت نے خاص کر۔ ان صدمات سے وہ اُبھر نہ پائے اور اسی دوران انھیں ۵ ؍مارچ ۱۹۷۷ء کو پھر دل کا دورہ پڑا تو انھیں اسپتال میں بھرتی کیا گیا جہاں وہ ۸ ؍مارچ کو صبح چھ بجے انتقال کر گئے۔

اسپتال میں اُن کی حالت کے بارے میں خواجہ احمد عباس نے اپنی یادداشت میں لکھا ہے کہ:

> ''کرشن چندر سے میں آخری بار بمبئی اسپتال میں ملا۔ میں وہاں پانچ بجے شام کو گیا تھا۔ اندر جانے کی ممانعت تھی مگر میں پھر بھی ڈاکٹر کی نظر بچا کر اندر پہنچ گیا۔ کرشن چندر تکیوں کے سہارے لیٹے تھے۔ کتنی نلکیاں اور بجلی کی تاریں اُن کے جسم میں لگی ہوئی تھیں۔ ٹخنے کی رگ کے ذریعہ گلوکوز دیا جا رہا تھا۔ ناک میں آکسیجن کی نلی لگی ہوئی تھی۔ چھاتی پر بائیں طرف کو اُن کی کھال کے نیچے پیس میکر لگا ہوا تھا۔ جو ایک بیٹری سے چلنے والا آلہ ہے جو دل کی حرکت جب تشویش کے قابل ہو جائے تو اس کو آپ سے آپ چالو کر دیتا ہے۔..... پھر بھی مجھے کرشن چندر کے چہرے پر عمر میں پہلی بار مایوسی تو نہیں کہوں گا لیکن تھکن کے آثار نظر آئے۔ پہلے جب میں جاتا تھا تو وہ میرا استقبال اپنی خوبصورت اور میٹھی

مسکراہٹ سے کرتے تھے۔ اُن کی آنکھیں چمک اُٹھتی تھیں لیکن اُس دن ایک
ہلکی سی کڑوی سی مسکراہٹ اُن کے چہرے پر ایک پل کے لیے اُبھری اور پھر
دھیرے دھیرے فیڈ آؤٹ ہوگئی۔ آنکھوں کی گہرائی میں میں نے ایک ایسی
بجھتی ہوئی چمک دیکھی جو پہلے کبھی دکھائی نہ دی تھی''۔

وفات سے کچھ گھنٹے پیشتر کی تشویشناک صورتِ حال کو سلمیٰ نے یوں بیان کیا ہے:

''۷/ مارچ کی رات کو ان پر ایک کے بعد ایک تین بار دل کا دورہ پڑا۔ رات
کے آخری پہر میں انھوں نے مجھ سے کہا۔ سلمیٰ! نیچر سے اتنی جنگ کرنا ابھی
ٹھیک نہیں ہے، میرا بلاوا آہی گیا ہے تو مجھے مسکراتے ہوئے رخصت کرو
اور میرے بعد یہاں سے فوراً چلی جانا۔ رونے دھونے کی ضرورت نہیں۔
یہاں اور بھی کئی مریض ہیں۔ ممکن ہے تمھارے رونے کی آواز سے انھیں
تکلیف ہو۔ میں جانتا ہوں کہ میری زندگی کا سفر ختم ہو چکا ہے اور تم اس بات پر
پھوہڑپن سے ماتم نہیں کروگی''۔ (۱۱)

کہا جاتا ہے کہ شدید قلبی دورے سے پہلے انھوں نے ایک طنزیہ مضمون ''ادب برائے
بطخ'' لکھنے کی کوشش کی تھی مگر چند سطور ہی لکھ پائے۔ سطور اس طرح ہیں:

''نورانی کو بچپن ہی سے پالتو جانوروں کا شوق تھا۔ کبوتر، بندر، رنگ برنگی
چڑیاں...''

اس کے بعد ان پر شدید قلبی دورہ پڑ گیا اور عبارت ادھوری رہ گئی۔

......اور آخر اُردو کا یہ عظیم افسانہ نگار چار قلبی دوروں سے نبرد آزما ہونے کے بعد ۸/ مارچ
۱۹۷۷ء کو اس دنیائے فانی سے رخصت ہوگیا اور اس کے جسدِ خاکی کو اسپتال سے ان کے بنگلے
پر لایا گیا جہاں ہندو رسم و رواج کے مطابق اُن کی ارتھی تیار کی گئی اور جب پھولوں سے لاد کر انھیں
شمشان گھاٹ لے جانے کے لیے اُٹھایا گیا تو اُن کی بیوی ودیاوتی نے اُن کے جسدِ خاکی کو چھوا
اور احتراماً انھیں آخری بار دونوں ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا۔ سلمیٰ بھی اُن کے پاس ہی کھڑی تھیں،
انھوں نے سرگوشی میں پوچھا اگر ہندو مذہب کے خلاف نہ ہو تو میں اُن کے گال کو چھولوں۔ اُن کی
اس خواہش کا احترام کرتے ہوئے انھیں اس کی اجازت دے دی گئی۔ پھر سلمیٰ فرش پر دوزانو بیٹھ
گئیں اور کرشن چندر کے منہ پر منہ رکھ کر دہاڑیں مار مار کر رونے لگیں۔ پھر بڑی مشکل سے انھیں

اُٹھا کر شب خوابی کے کمرے میں لے جایا گیا۔

جب جنازہ اُٹھایا جانے لگا تو اُن کے برسوں پرانے عزیز دوست راجندر سنگھ بیدی نے کہا ارتھی کو سب سے پہلے کندھا میں دوں گا کیونکہ میں اُن کا ہم پیشہ، ہم مشرب اور ہمراز تھا اور میں ان کا حقیقی وارث ہوں۔ لہٰذا سب سے پہلے کندھا راجندر سنگھ بیدی اور خواجہ احمد عباس نے دیا اور تقریباً ایک سوا عزا و اقارب اور اُن کے دوست اور پرستار شامل تھے جن میں خواجہ احمد عباس، کملیشور، ڈاکٹر رفیق زکریا، ظ۔ انصاری، ڈاکٹر دھرم ویر بھارتی، مجروح سلطان پوری، راما نند ساگر، عزیز قیسی، حسن کمال، شمیم احمد، نوٹیال وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ جب اُن کی ارتھی کو لے کر شمشان گھاٹ کی طرف روانہ ہوئے اُس وقت اُن کا بیٹا رنجن آگے آگے ہانڈی لیے چل رہا تھا اور ماحول میں 'رام نام ست' کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ شمشان گھاٹ میں موجود ادیبوں نے انھیں خراج عقیدت پیش کیا۔ خواجہ احمد عباس نے کہا "لگتا ہے کرشن نہیں، آج میں مر گیا ہوں"۔ ظ۔ انصاری نے اپنے غم کا اظہار ان الفاظ میں کیا "کرشن چندر ہمارے جواہر لال تھے۔ وہ گلاب کا پھول تھے۔" مجروح سلطان پوری نے اپنے دکھ کا اظہار ان الفاظ میں کیا "آج دنیا سے اکیلا کرشن چندر ہی نہیں اُٹھا۔ آج یاروں کی بھری محفل اُٹھ گئی ہے۔" کملیشور نے کہا "میں نے اپنے پتا جی کی موت نہیں دیکھی، آج دیکھ رہا ہوں" راما نند ساگر نے اپنے غم کے اظہار میں کہا "کرشن چندر کی زندگی کا واحد مقصد پیار کرنا تھا۔ وہ تو اُن سے بھی پیار کرتا تھا جو اس سے پیار نہیں کرتے تھے، یہی پیار کرنے کی لگن آج ہم یہاں سے اپنے ساتھ لے جائیں گے تو کرشن مرے گا نہیں ہمارے ایک دوسرے کے پریم میں امر ہو جائے گا۔" راہی معصوم رضا نے چند اشعار پر مشتمل شردھانجلی دی جس میں ایک شعر تھا:

ہر پردہ ہے چاکِ گریباں، ہر دیوار سوالی ہے

اک ان کے جانے سے یہ گھر کتنا خالی خالی ہے

انھیں بمبئی کے شمشان گھاٹ میں ہندو رسم و رواج کے مطابق نذر آتش کیا گیا تو مقام افسوس ہے کہ اس عظیم المرتبت فکشن نگار کے سانحۂ ارتحال پر جسے "ایشیا کا سب سے بڑا افسانہ نگار" کہا جاتا تھا، اُس کی ارتھی میں کوئی سوا سو کے قریب افراد نے اور ۱۳ر مارچ کو صابو صدیق ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ میں اُن کے تعزیتی جلسے میں صرف تین سو حضرات نے شرکت کی تھی جن میں ادبی، سماجی، سیاسی اور فلمی ہستیاں بھی شامل تھیں۔

اُن کی موت پر ادا کی گئی رسوم پر بھی کئی طرح کے اعتراضات اُٹھائے۔ پہلا اعتراض تو یہ تھا کہ جب وہ مذہب اسلام قبول کر کے مشرف بہ اسلام ہوئے تھے تو انھیں جلانے کے بجائے دفن کرنا چاہیے تھا۔ یہ سوال اُن کی وفات کے بعد سلمٰی صدیقی سے بھی پوچھا گیا تھا تو انھوں نے کہا کہ کرشن جی نے انھیں زبانی کہا تھا کہ ''سلمٰی میرے مرنے کے بعد تم جس طرح چاہو میری آخری رسوم ادا کرنا اور میں نے اُن کے اعزا و اقارب کے جذبات کو ملحوظ رکھتے ہوئے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا۔ کیونکہ کرشن چندر نے اس کے بارے میں کوئی واضح ہدایت یا وصیت نہیں کی تھی۔

اُن پر یہ بھی اعتراض تھا کہ جن مذہبی عقائد اور دقیانوسی خیالات اور اوہام پرستی کے خلاف وہ آواز بلند کرتے رہے مگر کوئی وصیت یا ہدایت نہ دی کہ ان کے مرنے کے بعد انھیں کیسے ٹھکانے لگایا جائے اور آخری رسوم کیا ہوں؟ نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کی آخری رسوم ہندو ریتی رواج کے مطابق ادا کی گئیں۔ یعنی ان کے اعمال و افعال میں بہت تضاد نظر آتا ہے اور احساس ہوتا ہے کہ ہم جس طرح کے خیالات و نظریات پر کاربند ہوتے ہیں اُس پر پورے نہیں اُترتے لیکن اس اعتراض کے خلاف ایک جواز یہ ہے کہ اگر وہ وصیت بھی کرتے تو شاید اُن کے رشتہ دار اُس پر عمل پیرا نہ ہوتے کیونکہ بہت سے لوگوں نے بڑی دیانت داری سے تحریری وصیت کی کہ اُن کے جسدِ خاکی کو کسی اسپتال یا میڈیکل ادارے کو دے دیا جائے مگر اُن کی رحلت کے بعد اس پر عمل نہیں کیا گیا کیونکہ ''مردہ بدست زندہ'' والا معاملہ ہے۔ اعزا و اقربا اپنے مذہبی رسم و رواج کے مطابق ہی آخری رسوم ادا کرتے ہیں۔ بہت کم ہی ہوتے ہیں جن کی وصیت کو عملی جامہ پہنایا جاتا ہے۔ باقی یہی بہتر بھی ہے کہ اگر مرنے والے نے کوئی وصیت نہیں چھوڑی تو اُس کی آخری رسوم اُس کے مذہب کے مطابق ہی انجام دی جائیں جس میں وہ پیدا ہوا ہے اور جس سے اُس کے رشتہ دار تعلق رکھتے ہیں۔

کرشن چندر کی دو بڑی خواہشیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ ایک بار لاہور جا سکیں اور دوسری یہ کہ وہ اپنی وفات سے دو تین سال پیشتر کشمیر کے کسی کونے میں بیٹھ کر اپنی خودنوشت اور ٹالسٹائی کے ''وار اینڈ پیس'' کی طرح ایک بڑا شاہکار ناول لکھ سکیں مگر افسوس کہ ان کی دونوں خواہشیں پوری نہ ہو سکیں۔

واحسرتا کہ خاک شدہ

حوالہ جات

۱۔ کرشن چندر نمبر ماہنامہ شاعر بمبئی، ص: ۲۷۔

۲۔ کرشن چندر از مہندر ناتھ۔ اُردو بک ڈائجسٹ لاہور کرشن چندر نمبر، ص: ۲۱۱

۳۔ کرشن چندر شخصیت اور فن از جگدیش ودھاون ص۔ ۶۸۔ ۲۶۷۔

۴۔ ہم زبان ہم داستان از مناظر عاشق ہرگانوی، شاعر بمبئی کرشن چندر نمبر ۱۹۶۷ء، ص: ۲۴)

۵۔ فن و شخصیت بمبئی آپ بیتی نمبر ستمبر ۱۹۷۸ء

۶۔ کنہیالال کپور لاہور سے ماسکو تک ماہنامہ شاعر، کرشن چندر نمبر، ص: ۶۳۔ ۶۴

۷۔ کرشن چندر شخصیت اور فن از جگدیش چندر ودھاون، ص: ۸۳۔ ۸۴، کرشن جھلکیاں "آدھے سفر کی پوری کہانی، ص: ۴۲۔ ۴۵

۸۔ کرشن چندر از جگدیش چندر ودھاون، ص: ۱۰۲

۹۔ کرشن چندر از جگدیش چندر ودھاون۔ عکسِ خط، ص: ۲۴۱۔ ۲۴۰

۱۰۔ سعادت حسن منٹو مرتبہ ضیا ساجد میں شامل مضمون سعادت منٹو از کرشن چندر کا اقتباس صفحہ ۱۴۔ ۱۵۔ ۱۱۔ کرشن چندر از جیلانی بانو صفحہ ۱۶ مطبوعہ ساہتیہ اکادمی نئی دہلی۔

◆◆◆

آدھے گھنٹے کا خدا

دو آدمی اُس کا پیچھا کر رہے تھے۔

اتنی بلندی سے وہ دونوں نیچے سپاٹ کھیتوں میں چلتے ہوئے دو چھوٹے سے کھلونوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ دونوں کے کندھوں پر تیلیوں کی طرح باریک رائفلیں رکھی نظر آ رہی تھیں۔ یقیناً اُن کا ارادہ اُسے جان سے مار دینے کا تھا۔ مگر وہ لوگ ابھی اُس سے بہت دُور تھے۔ نگاہ کی سیدھ سے اُس نے نیچے کی طرف دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں اندازہ کیا جہاں پر مَیں ہوں، وہاں تک اُن دونوں کو پہنچنے میں چار گھنٹے لگیں گے۔ تب تک......!

اُس نے پُر اُمید نگاہ سے گھوم کر اپنے اُوپر پہاڑ کی چوٹی کو دیکھا۔ سارود پہاڑ کی بارہ ہزار فٹ اونچی چوٹی اُس سے اب صرف ایک گھنٹے کی مسافت پر تھی۔ ایک دفعہ وہ چوٹی پر پہنچ جائے۔ پھر دونوں کے ہاتھ نہ آ سکے گا۔ سارود پہاڑ کی دوسری طرف گڈیال کا گھنا جنگل تھا، جو اُس کا دیکھا بھالا تھا۔ جس کے چپے چپے سے وہ اُتنی ہی آگاہی رکھتا تھا، جتنا اُس جنگل کا کوئی جانور رکھ سکتا ہے۔ اس جنگل کے خفیہ راستے، جانوروں کے بھٹ، پانی پینے کے مقام سب اُسے معلوم تھے۔ اگر ایک دفعہ وہ سارود پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گیا تو پھر اپنا پیچھا کرنے والوں کے ہاتھ نہ آ سکے گا۔

جب وہ چوٹی پر پہنچ جائے گا تو اُسے دوسری طرف کی سرسبز ڈھلوانوں پر گڈیالی کا جنگل دکھائی دے گا اور جنگل سے پرے سرحد کا پُل، جسے ڈائنامائٹ لگا کر اُڑا دیا گیا تھا۔ گرے ہوئے پُل کے اُس پار اُس کا اپنا دیس تھا۔ ایک بار وہ چوٹی پر پہنچ جائے پھر اُسے نیچے ڈھلوان کے گھنے جنگل کو طے کرنے میں دیر نہیں لگے گی۔ اگر پُل نہیں ہے تو کیا ہوا۔ وہ بہت عمدہ تیراک ہے۔ وہ گڈیالی ندی عبور کر کے اپنے دیس پہنچ جائے گا۔

اور چوٹی تک پہنچنے میں اُسے صرف ایک گھنٹہ لگے گا اور وہ دونوں اُس کے دشمن ابھی اُس سے چار گھنٹے کی مسافت کے فاصلے پر تھے۔ نہیں وہ اسے نہیں پکڑ سکتے۔ وہ جوان ہے مضبوط ہے اور چار گھنٹے اُن سے پہلے چلا ہے۔ وہ اُسے نہیں پکڑ سکتے۔ وہ ابھی اس چٹان پر پندرہ بیس منٹ بیٹھ کر دم لے سکتا ہے اور دُور نیچے کھیتوں سے گزرتے ہوئے گھاٹیوں کی طرف آنے والے اُن دونوں آدمیوں کو بڑے اطمینان سے دیکھ سکتا ہے، جو اُس کی جان لینے کے لیے آرہے ہیں۔ وہ مسکرا بھی سکتا ہے۔ کیوں کہ وہ اُن سے، بہت دُور ہے۔

یقیناً انھوں نے اُسے دیکھ لیا ہے کیوں کہ نیچے کے کھیتوں سے چوٹی تک اُس طرف کا پہاڑ جس کے اُوپر وہ چل رہا ہے، بالکل ننگا ہے۔ بس چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں ہیں...... سنبھتے کی اور لال ٹینا کی، جن میں آدمی چھپ بھی نہیں سکتا اور زمین سے لگی ہوئی پتلی چھدری گھاس ہے اور نیچی نیچی سیاہ چٹانیں...... رات کی بارش سے بھیگی ہوئی۔ اور پرانی کائی سے پھسلوان۔ اُس پرانی کائی سے بند پانی کی بو آتی ہے اور بھر بھری مٹی پر قدم پھسلتے ہیں۔ اُسے بڑی ہوشیاری سے آگے کا فاصلہ طے کرنا ہوگا۔ جبھی تو اُس نے اِس فاصلے کو طے کرنے کے لیے جو آدھے گھنٹے میں بآسانی طے ہو سکتا ہے۔ ایک گھنٹہ رکھا ہے۔

بس اُسے صرف اس بات کا افسوس ہے کہ وہ نیچے کے گاؤں سے بھاگتے وقت کیوں اپنی رائفل ساتھ نہ لا سکا۔ بھاگتے وقت اُس نے رائفل وہیں چھوڑ دی۔ یہ ایک ناقابلِ معافی حادثہ تھا مگر اب کیا کیا جا سکتا تھا؟ اگر اس کے پاس اس وقت اپنی رائفل ہوتی تو وہ دونوں نیچے سے آنے والے اس قدر بے خوفی سے اُس کا پیچھا نہیں کر سکتے تھے۔ وہ آسانی سے کسی چٹان کی اوٹ میں دبک کر کسی مناسب جگہ پر اُن کا انتظار کر سکتا تھا اور اپنی رائفل کی رینج میں آتے دیکھ کر اُن لوگوں کو گولی کا نشانہ بنا سکتا تھا مگر وہ کیا کرے، اس وقت وہ بالکل نہتا ہے اور اب ہر لحظہ اس کی یہ کوشش ہوگی کہ وہ اُن کی بندوق کی مار سے آگے چلتا رہے!

اُس نے تعاقب کرنے والوں کے پیچھے بھی دُور تک کھیتوں کو دیکھا۔ ایک لمحہ کے لیے اُس کے دل کے اندر اُداسی کی ایک گہری سُرخ لکیر کھنچتی چلی گئی۔ اُس خنجر کی باریک اور تیز دھار کی طرح جس کا پھل اُس وقت موگری کے دل میں پیوست تھا۔ موگری جو سیب کے پھولوں کی طرح خوبصورت تھی۔

کاشر کے لیے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ وہ موگری کی جان لے لے۔ چمکتی ہوئی گہری سیاہ

آنکھوں والی موگری۔ انگاروں کی طرح دہکتے ہوئے ہونٹوں والی، اُنیس برس کی موگری۔ وہ جب ہنستی تھی تو ایسا لگتا تھا گویا سیب کی ڈالیوں سے پھول جھڑ رہے ہیں۔ ایسی مہکتی ہوئی سپید ہنسی، اُس نے کسی دوسری لڑکی کے پاس نہ دیکھی تھی۔ ہنسی جو سیب کے پھولوں کی یاد دلائے، یا اچانک پر کھول کر ہوا میں کبوتری کی طرح اُڑ جائے اور وہ ذرا سے کھلے، ذرا سے بند انگاروں کی طرح دہکتے ہوئے شریر ہونٹ۔ اُن ہونٹوں پر جب وہ اپنے ہونٹ رکھ دیتا تو اُسے ایسا محسوس ہوتا تھا، جیسے اُس کے خون کے بہاؤ میں چنگاریاں سی اُڑتی چلی جا رہی ہیں، جیسے جذبہ پگھل کر خون اور خون پگھل کر شعلہ اور شعلہ پگھل کر بوسہ بن گیا ہو اور وہ پوری طرح موگری کے چہرے پر جھک جاتا تھا۔ اتنے زور سے کہ موگری کی سانس اُس کے سینے میں رُکنے لگتی تھی اور وہ اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے اُس کے منہ پر طمانچے مار کر ہی اپنا چہرہ اُس کے چہرے سے الگ کر سکتی تھی۔

''تم بالکل جانور ہو کاشر!'' وہ ہانپتے ہوئے کہتی۔

''اور تم آگ ہو!'' وہ خود اپنے جذبے کی شدت سے ڈر کر پیچھے ہٹتا ہوا کہتا۔

''میرے گاؤں میں کوئی نہیں جانتا کہ میں ایک دشمن کے بیٹے سے پیار کرتی ہوں۔''

''میرے سپاہیوں میں سے بھی کوئی نہیں جانتا کہ میں گڈیالی کے جنگل میں روز کس سے ملنے جاتا ہوں۔''

وہ دونوں گڈیالی کے جنگل میں جیپ کے کسی کچے راستے پر بیٹھ جاتے۔ دیودار کے ایک ٹوٹے ہوئے تنے پر، پیچھے جیپ کھڑی ہوتی سامنے ایک چھوٹی سی ڈھلوان کی گہری اور دبیز گھاس۔ کوئی چشمہ تقریباً بے آواز ہو کر بہتا تھا۔ جنگلی پھولوں پر پانی کے قطرے گر کر سو جاتے اور چاروں طرف بڑے بڑے ستونوں کی طرح اُونچے اُونچے دیودار اور اُن کے گھنے چھتناروں میں سے سبزی مائل روشنی دُور اُونچے لٹکے ہوئے فانوسوں کی طرح چھن چھن کر آتی ہوتی...... کاشر کو ایسا محسوس ہوتا گویا وہ کسی مغل بادشاہ کے دیوانِ خاص میں بے اجازت آنکلا ہے۔ یہاں آ کر وہ دونوں کئی منٹ تک جنگل کے گہرے سناٹے میں کھو جاتے اور آہستہ آہستہ سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگتے۔ کبھی ایسا لگتا جیسے سارا جنگل چپ ہے۔ کبھی ایسا لگتا جیسے سارا جنگل اُن کے اِردگرد سرگوشیوں میں باتیں کر رہا ہے۔

موگری، علاقہ غیر کے گاؤں سے ایک ٹوکری میں پھل اُٹھائے ہوئے گڈیالی کے پل تک آتی تھی۔ جو کاشر اور اُس کے سپاہیوں کی عملداری میں تھا۔ سیب، ناشپاتی، کیلے، آلوچے، بہی،

کیمب، اودے انگوروں کے گچھے یا صرف اخروٹ اور مکئی کے بھٹے اور وہ چھوٹی چھوٹی خوبانیاں جنھیں دیکھ کر سنہری اشرفیوں کا دھوکہ ہوتا ہے اور موگری اتنی خوبصورت تھی کہ پُل کی حفاظت کرنے والے سپاہی چند منٹوں میں اُس کی ٹوکری خالی کر دیتے تھے۔ سب سے آخر میں کاشر آتا تھا اور جب کاشر، موگری کے نزدیک آتا تھا۔ تو سب سپاہی ہٹ جاتے تھے، کیوں کہ وہ جانتے تھے۔

لیکن جس دن موگری کی مخبری پر علاقہ غیر کے گاؤں والوں نے گڈیالی کا پُل جو اُس کی تحویل میں تھا، ڈائنامائٹ سے اُڑا دیا، اُس دن اُس کو شدید دھچکا لگا۔ جیسے اُس کے دل کے اندر بھی کوئی پُل تھا جو ڈائنامائٹ سے پُرزے پُرزے ہو گیا تھا۔ اور وہ باہر کا پُل تو کبھی نہ کبھی پھر بن جائے گا لیکن اندر کا پُل کون بنا سکے گا پھر سے؟ اِس لیے وہ وحشت زدہ سا ہو کر پُل کے ٹکڑوں کو اُن گہرے پانیوں میں جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ جہاں لطیف سے لطیف جذبے بھی بھاری پتھر بن کر ایسے ڈوب جاتے ہیں کہ پھر کبھی نہیں اُبھر سکتے۔ وہ رونا چاہتا تھا مگر اُس کی آنکھوں میں آنسو نہ آ سکے اور وہ موگری کو گالی دینا چاہتا تھا مگر اُس کی زبان پر الفاظ نہ آ سکے۔ وہ جانتا تھا کہ ہر سپاہی کی نگاہ اُس پر ہے۔ وہ نگاہ جو بظاہر کچھ نہیں کہتی لیکن خاموش لہجے میں شکایت کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ جب وہ اُن نگاہوں کی تاب نہ لا سکا تو اپنی رائفل لے کر گڈیالی ندی میں کود پڑا اور اُس کے سپاہی بھونچکے ہو کر اُس کی طرف دیکھتے رہ گئے۔

وہ ندی پار کر کے گڈیالی کے جنگل میں گھس گیا۔ کئی دن تک وہ اکیلا، بھوکا پیاسا اُس جنگل میں گھومتا رہا اور وہ ان تمام جگہوں پر گیا، جہاں پر وہ موگری کے ساتھ گیا تھا اور اُن جگہوں پر جا کر اُس نے تمام جذبوں کو بھلانا چاہا، جنھوں نے موگری کی موجودگی میں اُس کے لیے دُھندلے دُھندلے شفق زار تعمیر کیے تھے۔ کئی بار وہ موگری کی عدم موجودگی میں بھی یہاں آیا تھا تو بھی اُسے ہر جگہ موگری کی عدم موجودگی میں بھی اُس کی موجودگی کا احساس ہوا تھا۔ وہ پیڑ کا تنا جہاں موگری بیٹھتی تھی۔ اُس کے گرد اِک ہالہ سا کھنچا معلوم ہوتا تھا۔ موگری نہ تھی۔ پھر بھی گویا جھرنے کے پانیوں میں اُس کی آواز کی روانی گھل گئی تھی۔ ہر پھول میں اُس کے بالوں کی مہک تھی اور وہ زمین جہاں پر وہ بیٹھتے تھے، وہاں سے موگری کے جسم کی سوندھی سوندھی مہک آتی تھی۔

مگر آج وہاں کچھ نہ تھا۔ جذبوں کے شفق زار چھٹ گئے تھے۔ پیڑ کا تنا محض پیڑ کا تنا تھا۔ اور پانی کا جھرنا، پانی کے جھرنے کی طرح بہہ رہا تھا۔ ہر چیز انجانی اور اجنبی اور اُس سے الگ الگ

کھڑی تھی۔ وہ چیخ مار کر سارے جنگل کو جگا دینا چاہتا تھا مگر اس کا حلق بار بار گھٹ رہا تھا۔ اس کے سارے احساسات پر ایک دُھند سی چھائی ہوئی تھی۔ جنگل میں بے سمت گھومتے گھومتے کئی بار اُسے خیال آیا کہ اگر وہ اس دُھند کو اپنے ناخنوں سے چیر دے تو شاید اندر سے موگری کا زندہ اور اصلی چہرہ صحیح وسلامت نکل آئے گا۔ وہ موگری جسے وہ اپنے دل سے پہچانتا تھا مگر وہ دُھند کسی طرح نہ چھٹی اور گہری ہوتی گئی۔ جنگل میں اُس کا دم گھٹنے لگا۔ پیڑوں کا گھیرا اُس کے لیے تنگ ہونے لگا۔ اُسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے چاروں طرف سے جنگل کے پیڑ جھک کر اُس پر گرنے والے ہیں۔

پھر وہ گھبرا کر جنگل سے باہر بھاگ نکلا اور گڈیالی کا جنگل طے کر کے وہ سارود پہاڑ کی برفیلی چوٹی کے دوسری طرف اُتر گیا جہاں موگری کا گاؤں تھا۔

کئی دنوں تک بھیس بدلے ہوئے وہ ٹوہ لیتا رہا۔ کسی کو اُس پر شبہ نہ ہوا کیوں کہ اُس کی شکل وصورت ایسی تھی جیسے علاقہ کے لوگوں کی ہوتی ہے۔ اُس کے کپڑے بھی پھٹے ہوئے تھے اور وہ اُن کی زبان بخوبی بول سکتا تھا۔ اس لیے کسی کو اُس پر شبہ نہ ہوا اور وہ ایک دن موقع دیکھ کر آدھی رات کو موگری کے گھر کے اُس کمرے میں گھس گیا جہاں موگری سو رہی تھی۔ موگری کمرے میں اکیلی سو رہی تھی۔ اُس نے آہٹ کیے بغیر کنڈی اندر سے چڑھا دی۔ رائفل کندھے سے اُتار کر ایک کونے میں رکھ دی اور آہستہ آہستہ دُبک کر وہ موگری کے بستر کے قریب چلا گیا۔ قریب جا کر اُس نے اپنا خنجر نکال لیا۔

وہ خنجر ہاتھ میں لیے دیر تک کھڑا رہا اور موگری کے سانسوں کی پُرسکون آواز سنتا رہا۔ چاروں طرف گھپ اندھیرا تھا۔ وہ موگری کے چہرے کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اُس کے دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی کہ وہ ایک بار ماچس جلا کر موگری کا چہرہ دیکھ لے مگر بڑی جانکاہ کاوش سے اُس نے ایک اذیت ناک خواہش کو اپنے دل میں روک دیا۔ دیر تک وہ خنجر لیے یونہی کھڑا رہا اور موگری کے سانسوں کے اُس بے آواز جھرنے کو سنتا رہا جو اُس کے دل کی طرف بہہ رہا تھا۔ وہ ہولے ہولے موگری کے چہرے پر جھک گیا۔ بس ایک الوداعی بوسہ اور پھر خنجر! مگر جھکتے جھکتے اُس کے سانس کی رفتار تیز ہوتی گئی۔ اُس کے دماغ میں سنساتی ہوئی گونجیں سی چاروں طرف پھیلنے لگیں اور اُس نے اپنے جلتے ہوئے، کانپتے ہوئے ہونٹ موگری کے ہونٹوں پر رکھ دیے۔

موگری کے سارے جسم میں ارتعاش سا پیدا ہوا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے موگری چیخ مارنے

کو ہے مگر اُس نے ایسی مضبوطی سے اپنے ہونٹوں کو موگری کے ہونٹوں سے ملا رکھا تھا کہ چیخ مارنے کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا۔ پہلے تو موگری کا سارا جسم برف کی طرح سرد ہونے لگا اور ہمیشہ یونہی ہوتا تھا۔ اُسے اس سے پیشتر کے بہت سے رنگین اور خوبصورت لمحے یاد آئے، جب موگری پیار کرتے کرتے یک لخت اُس کے بازوؤں میں سرد پڑ جاتی تھی اور کئی لمحوں تک اُس کی یہی کیفیت رہتی تھی جیسے وہ دل و جان سے اُس کی مزاحمت کر رہی ہو۔ پھر ہولے ہولے اُس کے بوسوں کی آنچ سے اُس کا سارا جسم گرم ہونے لگتا۔ ہولے ہولے گویا برف پگھلنے لگتی اور بدن میں انگڑائیاں اور پھریریاں جاگنے لگتیں اور گرم گرم سانس آنچ کی طرح پگھلنے لگتی۔ اور وہ بے اختیار ہو کر کاشر سے لپٹ جاتی اور اپنے بازو اُس کی گردن میں حمائل کر دیتی۔ موگری کے دل کے اندر غالباً محبت اور نفرت کا ہر آن بدلتا ہوا میزانیہ سا چلتا رہتا تھا۔ اپنا دشمن سمجھ کر وہ اُس سے نفرت کرتی تھی۔ اپنا محبوب سمجھ کر اُس سے محبت کرتی تھی اور کبھی کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکی تھی۔

اس وقت بھی یہی ہوا۔ موگری کا سرد پڑتا ہوا خوفزدہ اور اپنے آپ میں اکیلا جسم دھیرے دھیرے لو دینے لگا۔ جیسے انگ انگ سے روشنی پھوٹ نکلے۔ ایسی روشنی جسے آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں۔ صرف ہاتھ محسوس کر سکتے ہیں۔ موگری نے یقیناً اُس بوسے کو پہچان لیا تھا۔ خوبصورت اور پُرخطر زندگی بسر کرنے والی عورت کی زندگی میں بہت سے بوسے آتے ہیں۔ دیمک کی طرح چاٹ جانے والے بوسے اور جونک کی طرح چمٹ جانے والے بوسے۔ رُوکھے سُوکھے پاپڑ نما بوسے اور ایسے لجلجے اور گندے بوسے، گویا ہونٹوں پر کیڑے چل رہے ہوں۔ شرمائے ہوئے، سہمے ہوئے بوسے اور خوفزدہ کمزور اور بیمار بوسے اور صحت مند اور شریر بوسے۔ موگری ایسی خوبصورت عورتوں کو ہر قسم کے بوسوں سے واسطہ پڑتا ہے مگر وہ یہ بھی جانتی ہیں کہ ان میں سے کونسا بوسہ ایسا ہوتا ہے جو دل پر دستک دیتا ہے۔ صرف اُسی دستک کے جواب میں وہ بوسے کے جواب میں بوسہ دیتی ہیں ورنہ صرف ہونٹ پیش کرتی ہیں۔

مگر اس بار موگری صرف چند لمحوں کے لیے برف کی طرح ٹھٹھرتی رہی۔ پھر اُس نے اپنے اُوپر جھکے ہوئے ہونٹوں کے لمس کو پہچان لیا اور پہچان کر بھی گو وہ چند لمحوں کے لیے وحشت زدہ اور ٹھٹھری سی رہی مگر ہولے ہولے اُس کی مغائرت دُور ہوتی گئی۔ آدھی رات کے نیم گرم اندھیرے میں کسی غیر متوقع خوشی سے اُس کی ساری رُوح کانپ اُٹھی اور وہ خود سے کاشر کے ہاتھوں میں آ گئی اور اس طرح سے آئی، جیسے اب تک کبھی نہ آئی تھی۔ کاشر نے محسوس کیا جیسے

آسمان زمین پر اُتر آیا ہو اور زمین لمبی لمبی سانس لے کر ہانپنے لگی ہو۔ ایک شعلہ سا تھا جو برف کی پنہائی میں ڈوب رہا تھا۔ برف کی ٹوٹتی ہوئی ٹکڑیاں گلاب کی بکھری ہوئی پتیاں۔ سسک سسک کر سلگتا ہوا سنگیت جسم کے حصار کو توڑنے کی کاوش میں افتاں وخیزاں۔ یکا یک حصار ٹوٹ گیا۔ مچھلیاں طوفان میں بہہ گئیں۔ بہت سارے چراغ اِک دم گل ہو گئے۔ پھر سارے احساس نیم غنودگی کی سبز جھیل میں کھو گئے۔

جب وہ جاگا تو اُسی طرح گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا اور موگری اُس کی بے خبر بانہوں میں سو رہی تھی۔ جانے اس بے خبری میں کب کاشر نے خود اپنے ہاتھ کا خنجر اپنے پہلو میں رکھ لیا تھا!

اُس نے پہلو بدل کر آہستہ سے خنجر نکالا۔ آہستہ سے موگری نیند میں کسمسائی۔ جھکے ہوئے کاشر کو موگری کا ہاتھ اپنی پیٹھ پر محسوس ہوا۔ تھپکتا ہوا۔ نیند کی ترغیب دیتا ہوا۔ پیشتر اس کے کہ وہ پھر اپنے جذبات کے دھارے میں بہہ جائے۔ اُس نے ایک ہی جھٹکے سے پورا خنجر ہتھی تک موگری کے دل میں اُتار دیا۔

موگری چیخ بھی نہ سکی۔ ہولے ہولے اُس کا کانپتا ہوا جسم ٹھنڈا ہوتا گیا مگر کاشر نے موگری کو بہت دیر تک اپنے جسم سے الگ نہیں کیا۔ ہولے ہولے کاشر کے جسم نے موگری کے مرتے ہوئے جسم کے ہر ارتعاش کو اپنے اندر جذب کر لیا اور جب موگری کا جسم بالکل ٹھنڈا ہو گیا تو اُس نے موگری کے جسم کو اپنے جسم سے الگ کر دیا۔ اُس کے ٹھنڈے ہونٹوں کو پھر اسی طرح بوسہ دیا جیسے وہ کسی قبر کو بوسہ دے رہا ہو۔ پھر کُنڈی کھول کر باہر آنگن میں آیا اور تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے وہ آنگن کی دیوار پھلانگ کر ایک احمق کی طرح سرپٹ بھاگنے لگا۔ کیوں کہ اب اُس کے دماغ کی ہر رگ اور نس تانبے کے تاروں کی طرح جھنجھنا رہی تھی اور جسم کے روئیں روئیں میں خطرے کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ یہ اُس کی خوش قسمتی تھی کہ سارا گاؤں نیند میں ڈوبا ہوا سو رہا تھا۔ کسی نے اُس کے جسم میں بجتی ہوئی خطرے کی گھنٹیوں کی پُرشور صدا کو نہیں سُنا اور وہ کھیتوں سے نکل کر ساردو پہاڑ کی چڑھائی پر چڑھنے لگا۔ صبح جب موگری کے بھائیوں نے موگری کی لاش دیکھی اور دیوار سے لگی ہوئی رائفل کو پہچانا تو اُس کا تعاقب کیا مگر اب تک اُسے چار گھنٹے کا اسٹارٹ مل چکا تھا۔

اتنی دُور سے وہ انھیں دیکھ سکتا تھا۔ موگری کے دونوں بھائی برابر قدم سے قدم ملائے تیز تیز چل رہے تھے۔ وہ موگری کے بھائیوں کو جانتا تھا۔ وہ دونوں بہادر اور جری، دلیر اور جفاکش تھے۔

اُس کی طرح پُر خطر زندگی کے عادی تھے، مستقل مزاج، غیور اور انتقام پسند تھے۔ وہ اُن سے کسی رحم کی توقع نہ کر سکتا تھا، درخواست بھی نہ کر سکتا تھا۔ پہلی بات اُن کے کردار کے خلاف ہوتی۔ دوسری اُس کے اپنے مزاج کو ناپسند ہوتی۔ اگر رائفل اس کے ہاتھ میں ہوتی تو وہ اُن دونوں کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ وہ اتنا فاصلہ ضرور رکھے گا کہ کسی طرح اُن کی رائفل کی زد میں نہ آسکے۔ وہ دونوں بہت تیزی سے منجھے ہوئے مشاق پہاڑی خچروں کی طرح چل رہے تھے۔ وہ بھی برابر یکساں لَے میں چھوٹی چھوٹی سانس لیتا ہوا ساردو کے اُوپر چڑھ رہا تھا مگر فاصلہ دھیرے دھیرے کم ہو رہا تھا کیوں کہ وہ دونوں کھیتوں میں تھے۔ سیدھے اور سپاٹ راستے پر اور وہ پھسلواں چڑھائی پر۔ جہاں کائی لگی چٹانیں تھیں اور بھربھری مٹی اور کل رات کو جب وہ موگری کی آغوش میں تھا، کسی وقت ساردو پہاڑ کی اونچائی پر بارش ہو چکی تھی اور سارا پہاڑ گیلا تھا اور بُھربھری مٹی میں دھنسی ہوئی چٹانیں اپنی جگہ سے ہلتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں اور اُسے ہر قدم نہایت احتیاط سے اور پھونک پھونک کر رکھنا پڑتا تھا اور جگہ جگہ رُک کر ایک لمحہ کے لیے پیچھے مڑ کر بھی دیکھنا پڑتا تھا کہ دونوں فریق ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے اور لمحہ بہ لمحہ اس تعاقب کا اندازہ کر سکتے تھے۔ بھاگنے والا بھی اور پیچھا کرنے والا بھی۔ دونوں اس تعاقب میں برابر ایک دوسرے کو نگاہ میں رکھنے پر مجبور تھے۔

دھیرے دھیرے صبح کے سپید سنہرے اور گلابی پردے آسمان سے سرکا دیے گئے اور سورج فلک کی نیلگوں کھڑکیوں سے نیچے جھانکنے لگا۔ دھیرے دھیرے اُس کی روشنی تیز سخت گیر اور بے رحم ہوتی گئی اور کاشر کو احساس ہونے لگا گویا سورج بھی اُس کا تعاقب کر رہا ہے۔ اُس کی گردن، چہرے اور پیٹھ سے پسینہ پھوٹ نکلا۔ روشنی اُسے اپنی پلکوں پر بیٹھی ہوئی محسوس ہونے لگی اور کرنوں کے کوڑے متواتر اُس کے جسم پر پڑنے لگے اور پیاس سے اس کے حلق میں کانٹے سے چبھنے لگے تو بھی وہ چلتا رہا۔ ساری صبح چلتا رہا، ساری دوپہر چلتا رہا، کبھی تیز، کبھی مدھم، کبھی مضبوط قدموں سے، کبھی تھکے بھاری قدموں سے، ایک لمحہ رُکے بغیر چلتا رہا۔ پیاس نے اُس کا حلق بالکل خشک کر دیا تھا۔ گال، زبان، تالو، کاگ اور نرخرے میں ایسا لگتا تھا گویا کہیں سے خاردار جھاڑیاں اُگ آئی ہیں اور ہوا کی نالی سے ہوا یوں اندر باہر جاتی تھی جیسے لوہار کی خشک اور سخت کھردرے چمڑے والی دھونکنی سے نکلتی ہے۔ اب ہوا کی دھار بکھ کانٹے کی طرح تیز اور نکیلی تھی، تو بھی وہ چلتا رہا۔ کیوں کہ وہ رُک نہ سکتا تھا کیوں کہ اُس کا تعاقب کرنے والے بھی کہیں ایک لمحے کے لیے نہیں رُکے تھے۔ چلتے چلتے جب وہ ساردو پہاڑ کا تین چوتھائی سے زیادہ فاصلہ طے کر گیا اور جب اُسے

سارد و پہاڑ کی برفیلی چوٹی اونچی لمبی چٹانوں سے گھری ہوئی اپنے سر کے اُوپر نظر آنے لگی اور وہ سپید سپید بادل جو اُس کے بالکل نزدیک منڈلا رہے تھے، اس کے کندھوں کو چھوتے ہوئے محسوس ہوئے تو اُس نے چند لمحوں کے لیے آرام کرنا برحق جانا اور خطرے سے خالی بھی اور وہ لڑکھڑاتا ہوا بالکل مجبور ہو کر چٹانوں میں دَبے ہوئے ایک چھوٹے سے چشمے پر جھک گیا اور جانوروں کی طرح ڈیک لگا کر پانی پینے لگا۔ پانی پیتے پیتے اس نے بڑی کوشش سے اپنے آپ کو بیچ ہی میں روک کر نگاہ گھما کر نیچے کی طرف دیکھا۔ اُس کے تعاقب کرنے والے پہاڑ کا راستہ آدھے سے زیادہ طے کر چکے تھے۔ پھر بھی وہ کافی عرصہ کے لیے خطرے سے باہر تھا اور اب چوٹی دو ہزار فٹ کے فاصلہ پر گویا اُس کے سر کے اوپر اطمینان کا سایہ کیے کھڑی تھی۔ ایک جست اور پھر وہ خطرے سے باہر تھا۔ ایک دفعہ وہ چوٹی پر پہنچ جائے پھر گڈیالی کے جنگل میں اُسے کوئی نہیں پکڑ سکے گا۔

یہ خیال آتے ہی اُس نے اطمینان کی ایک سانس لی اور اپنا چہرہ سارے کا سارا پانی میں ڈوبا دیا۔ پانی پی کر اُس کا تنا ہوا گرم جسم ایک دم گویا سیراب سا ہو گیا۔ ڈھیلا پڑ گیا۔ اُس نے اپنی آنکھیں بڑے اطمینان سے بند کر لیں۔ وہ وہیں چشمے کے کنارے اپنے بدن کو ڈھیلا چھوڑ کے ٹانگیں پسار کے پڑ گیا۔ اُس نے آنکھیں بند کر لیں اور چند منٹ کے لیے ستانے کے لیے ایک نیم غنودگی کے عالم میں کھو گیا۔ ابھی تھوڑی دیر کے بعد بس چند منٹ کے بعد وہ تازہ دم ہو کے اُٹھے گا اور پہاڑ کا آخری حصہ طے کر کے چوٹی پر ہو گا اور خطرے سے باہر پہنچ جائے گا۔

وہ یونہی چند منٹ کے لیے اُسی نیم غنودگی کے عالم میں سُستاتا رہا۔ چند منٹ کے لیے اُس کے جسم کو آرام ملا تو اُس کے دل سے وقت کا احساس زائل ہو گیا۔ آرام کا ایک گنگنا تھپکنے والا نشہ تھا۔ جو اُس کے جسم و جان میں اُترا جا رہا تھا۔ اُسی عالم میں اُس نے پہلے دو ایک منٹ میں چوٹی کی بھُر بھری مٹی سے پھسل کر گرنے والی چٹانوں کی ایوالانش کی آواز سُنی۔ پھر یکا یک بڑھتی ہوئی گڑگڑاہٹ کی وہ آواز اُس کے کانوں میں آنے لگی تو وہ چونک کر اُٹھ بیٹھا۔ پھر وہ خوف اور دہشت کی ایک چیخ مار کر چشمے سے ہٹا اور چوٹی سے گرنے والے ہزاروں ٹن مٹی اور چٹانوں کے خوفناک تیزی سے نیچے کو بھاگتے ہوئے ملبے سے اپنی جان بچانے کے لیے ایک طرف کو بھاگا۔ بھاگتے بھاگتے بھی وہ اپنے آپ کو اس خوفناک ایوالانش کی زد سے نہ بچا سکا۔ ہزاروں توپوں کی گڑگڑاہٹ کے ساتھ ایک طوفان خیز زلزلہ سا گویا اُس کے سر کے قریب سے گزرا اور وہ

زمین پر بچھ گیا۔ اُسے اپنے حلق میں اور نتھنوں میں اور سانس کی نالی میں مٹی کے ذرّے گھستے ہوئے محسوس ہوئے اور ایک خوفناک کڑک سے ساری زمین کانپتی ہوئی۔ پھر کوئی انتہائی سخت سی چیز اس کی ٹانگوں سے ٹکرائی، جیسے کسی نے بڑے زور سے کوئی آہنی ہتھوڑا اُس کے دھڑ پر گرایا ہو اور وہ بیہوش ہو گیا۔

جب وہ ہوش میں آیا تو چند لمحوں تک اُسے یہ احساس رہا جیسے کہ وہ مر چکا ہے اور کسی گہری قبر میں دفن ہے۔ اُس کے چاروں طرف دائیں بائیں اوپر نیچے مٹی، کنکر، روڑے اور چھوٹی چٹانیں پڑی تھیں اور وہ ان میں اوندھا لیٹا تھا۔ پھر اُس نے آنکھیں کھول کر دیکھنے کی کوشش کی تو اُسے اپنے دونوں ہاتھ نظر آئے جو مٹی میں دھنسے تھے اس نے پہلے تو بڑی حیرت سے اپنے ہاتھوں کو دیکھا پھر آہستہ سے اُنھیں ہلایا۔ جب وہ ہلنے لگے تو اُس کا اچنبھا دُور ہوتا گیا۔ اُسے یقین آ گیا کہ وہ زندہ ہے۔ اُس نے بڑی کوشش سے لیٹے لیٹے پہلے اپنے دائیں ہاتھ کو مٹی اور کنکر کے ڈھیر سے آزاد کیا۔ پھر دوسرے ہاتھ کو پھر مٹی کھود کر اُس نے اپنے دھڑ کو آزاد کرایا۔ پھر اپنی بائیں ٹانگ کو۔ پھر جب وہ کسمسا کر اور کروٹ لینے کے انداز میں اپنی دائیں ٹانگ کو آزاد کرانے کے لیے زور لگانے لگا جو ایک بڑی چٹان کے نیچے دَبی تھی تو شدید درد اور اذیت کی ایک زور کی چیخ اُس کے حلق سے نکل گئی اور وہ اپنی کوشش میں ناکام ہو کر وہیں زمین پر پڑے پڑے ہانپنے لگا۔

جہاں پر وہ لیٹا تھا اور جس زاویے سے وہ لیٹا تھا، وہاں سے اُسے پہاڑ کے نچلے حصّے کا منظر بخوبی دکھائی دیتا تھا وہ دیکھ سکتا تھا کہ ایوالانش کا بھاری ملبہ اُس کے جسم سے بس چند منٹ کے فاصلے سے ہو کے گزرا ہے۔ چند لمحوں کی دیر ہو جاتی تو اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے اُڑ جاتے۔ یا چند لمحے قبل اگر وہ خبردار ہو جاتا تو اس ایوالانش کی زد سے وہ صاف بچ جاتا۔ اُس نے دُور تک پہنچے ایوالانش کے راستے کو دیکھا۔ ایوالانش جہاں جہاں سے گزری تھی۔ جھاڑیوں کو اکھاڑتی ہوئی ٹیلوں کو مسمار کرتی ہوئی، چٹانوں کو بہاتی، اِک گہری کھائی بناتی گزر گئی تھی۔ اِک لمحہ کے لیے اُس کے دل میں یہ اطمینان بخش خیال آیا کہ وہ دونوں مر گئے ہوں گے۔ اس ایوالانش کی زد میں آ کر لاکھوں ٹن مٹی کے نیچے اُن کے جسم دَب گئے ہوں گے۔ دوسرے لمحہ میں اُس نے دیکھا کہ نیچے ایک چٹان کی اوٹ سے وہ دونوں بھائی صحیح وسلامت نکل رہے ہیں۔ رائفلیں اُٹھائے ہوئے اور بڑی احتیاط سے پگ دھرتے ہوئے اپنی آنکھوں پر بار بار ہاتھ رکھ کر اُوپر کا راستہ دیکھتے ہوئے چلے آرہے ہیں۔ اُس کے چہرے پر ایک تلخ سی مسکراہٹ آ گئی۔

اپنے جسم و جان کا پورا زور لگا کر اُس نے اپنی دائیں ٹانگ کو بھی اُس بھاری چٹان سے آزاد کرالیا۔ چٹان جو لڑھکی تو دیر تک نیچے کو گڑگڑاتی ہوئی اُتر گئی۔ اُس کی آواز سے نیچے تعاقب کرنے والے چونکے اور انھوں نے اُسے اُٹھتے ہوئے دیکھ لیا مگر ابھی تک وہ بہت نیچے تھے اور وہ اُن کی رائفل کی زد سے باہر تھا۔

اپنے بائیں گھٹنے پر پورا زور دے کر وہ ہمت سے اُٹھ کھڑا ہوا مگر پہلا قدم لیتے ہی لڑکھڑا کر گر پڑا۔ اُس کی دائیں ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی۔ بالکل شکستہ ہو چکی تھی اور اس کے دھڑ کے اندر خطرناک ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں اور اب وہ چل نہ سکتا تھا۔ تو بھی وہ کوشش کر کے پھر اُٹھا اور اپنی دائیں ٹانگ کو اٹھاتے ہوئے ایک ہی ٹانگ سے راستے پر پھلانگ پھلانگ کر چلنے کی کوشش کرنے لگا۔ یقیناً نیچے تعاقب کرنے والوں نے اُسے دیکھ لیا تھا اور اب تیز تیز قدموں سے اس کا تعاقب کر رہے تھے۔ وہ دانت پیس پیس کر پھلانگ پھلانگ کر آگے بڑھتا رہا مگر درد لحہ بہ لحہ بڑھ رہا تھا اور وہ بیچ بیچ میں مجبور ہو جاتا کہ کسی چٹان پر بیٹھ کر جانوروں کی طرح ہانپ لے۔ درد کی ٹیسیں بڑھ رہی تھیں۔ اُس کا سارا جسم ایک کربناک اذیت سے کانپ رہا تھا اور فاصلہ کم ہو رہا تھا۔ وہ دونوں نزدیک آرہے تھے، نزدیک ہوتے جارہے تھے۔ وہ پھلانگتے پھلانگتے تقریباً دوڑنے لگا۔ بڑی نابرابر دوڑ تھی مگر وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اگر ایک لمحے کے لیے بھی ٹوٹی ہوئی ٹانگ کو زمین پر رکھتا تو آگ اور تیزاب کی ملی جلی جلتی ہوئی کیفیت سے دوچار ہوتا اور فوراً اپنی ٹوٹی ہوئی ٹانگ اُوپر اُٹھالیتا۔ پھلانگتے پھلانگتے وہ ہزار بارہ سوفٹ اور اُوپر بڑھ آیا۔ چوٹی اب اُس سے صرف پانچ سات سوفٹ کے فاصلے پر تھی مگر اب وہ بالکل بے دم ہو چکا تھا۔ اُس کے جسم میں چھریاں سی چل رہی تھیں۔ بار بار اُس پر نیم غشی کے دَورے پڑتے اور آنکھوں میں ترمرے سے ناچنے لگتے۔ اب اُس نے محسوس کیا کہ اس کا دھڑ بالکل بے کار ہو چکا ہے۔ اب وہ بالکل نہیں چل سکتا۔ کسی نہ کسی طرح زور لگا کر اُس نے اُٹھنے کی کوشش کی مگر جب اُس میں ناکام ہوا تو اُس نے سر نیچا کر کے لیٹے ہی لیٹے گھسیٹنا شروع کر دیا، اوپر کی طرف اپنے بازوؤں کی قوت سے وہ ہر فٹ اُوپر ہی اُوپر گھسیٹتا رہا۔ اس گھسیٹنے میں اُس کے گھٹنے چھل گئے۔ اُس کی کہنیوں سے خون بہنے لگا۔ ہاتھوں کی انگلیاں چھلنی ہوتی گئیں۔ اُس کے شانے چھل گئے۔ پھر بھی وہ لحہ بہ لحہ آگے ہی کو اُوپر ہی کو گھسیٹتا رہا۔ ساری زندگی کی کاوش اور اُمید اور محنت اور اُس کا درد، انتظار اس کی آنکھوں میں کھنچ آیا تھا اور وہ اپنے جسم سے نہیں بلکہ اپنی آنکھوں سے چلتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ آخری سوفٹ اب

اُس نے پیچھے کو دیکھنا چھوڑ دیا تھا۔ آخری پچاس فٹ...... آخری تیس فٹ...... وہ اُوپر ہی اُوپر گھسیٹتا گیا۔ پھر دانت پیس کر اور اپنے جسم سے زیادہ اپنی رُوح کا پورا زور لگا کر اور اپنی حیات کی مخفی قوتوں کو آواز دے کر اُس نے آخری تیس فٹ بھی انچ انچ گھسیٹ کر طے کر لیے اور پہاڑ کی سب سے اُونچی چٹان پر پہنچ گیا۔ جو تعاقب کرنے والوں کی طرف سیدھی بلّم کی طرح کھڑی تھی لیکن گڈیالی کے جنگل کی طرف ایک آرام کرسی کی طرح ڈھلوان شکل اختیار کیے ہوئے تھے۔ چوٹی پر پہنچ کر اُس نے اپنے آپ کو اُس چٹان کی اُونچی آرام کرسی پر گرا دیا اور ہانپتے ہانپتے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

جب اُس نے اپنی آنکھیں کھولیں تو گڈیالی کا سرسبز اور گھنا جنگل دور نیچے تک اُس کے قدموں میں پھیلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ندی کے پار اُس کے اپنے دیس میں آفتاب غروب ہو رہا تھا اور دُور دُور تک اُفق تا اُفق اُس کے دیس کی گھاٹیاں اور وادیاں، دھان کے کھیت اور لہراتی ہوئی ندیاں ایک نارنجی غبار میں کھو گئی تھیں اور جہاں پر کبھی پُل تھا وہاں پر دھنک کی محراب پھیلی ہوئی تھی۔ وہ دیر تک حیرت سے خوبصورت رنگوں کی اس نازک سی محراب کو دیکھتا رہا۔ جو اُس کے دل کے سپنوں کی طرح حسین تھی اور یکا یک اُسے احساس ہوا، جیسے اس کے سفر کی آخری منزل آ گئی۔ اب جس جگہ وہ پڑتی ہے وہاں سے وہ ایک اِنچ اِدھر اُدھر حرکت نہیں کر سکتا وہ چوٹی پر پہنچ گیا تھا اور اس کے جسم نے اُسے آخری جواب دے دیا تھا۔

اُس نے سر کی ایک ہلکی سی جنبش سے ٹوٹے ہوئے پُل کے کنارے اپنے وطن کے سپاہیوں کو سلام کیا اور پھر آنکھ کے کنارے سے نیچے دوسری طرف پہاڑ پر چڑھنے والے موگری کے دو بھائیوں کو آتے دیکھا اب وہ اُن کی رائفل کی زد میں تھا مگر وہ اُسے مار نہیں سکتے تھے کیوں کہ اُس کی پیٹھ پر ایک مضبوط دبیز چٹان تھی۔ انھیں اُسے مارنے کے لیے چوٹی تک آنا ہوگا اور چوٹی تک آنے میں انھیں ابھی آدھ گھنٹہ اور لگے گا۔

اُن کے آنے میں ابھی آدھ گھنٹہ باقی ہے!

چند لمحوں میں وہ بہت دُور اپنے بچپن کو لوٹ گیا اور اُن پہلے چند لمحوں میں اُسے اپنے بچپن کے، اپنے گاؤں کے پہاڑ یاد آئے۔ اونچے ٹیڑھے میڑھے راستے۔ موڑ پر کھڑے ہوئے اچانک اجنبیوں کی طرح نظر آ جانے والے دیودار اور ندیاں، شریر چرواہوں کی طرح گھاٹی پر دوڑتی ہوئی اور دُھوپ کا آنچل دھیرے دھیرے کسی وادی کے رُخ پر سرکتا ہوا اور خوشبو تاریک شاموں

کی، جن میں ننھے ننھے چراغ رات کے دھیمے سُروں کی طرح جگمگاتے ہیں اور محبت کی سرگوشی کی طرح مہکتے ہیں۔ چند لمحوں کے لیے وہ بہت دُور وہاں لوٹ گیا، جو اُس کی ابتدا تھی۔

پھر ابتدا سے وہ جو پلٹتا تو اگلے چند لمحوں میں اپنی پوری زندگی پھلانگ گیا اور یکا یک اُسے محسوس ہوا کہ اب تک اُس نے جتنی زندگی گزاری وہ دوسروں کے لیے تھی۔ موگری کی پہلی وفا کے لیے اور اُس کی آخری بے وفائی کے لیے اپنے ملک کی محبت کے لیے اور اُس کے آخری انتقام کے لیے اور آخر میں اُس خندق کے لیے جو دِلوں کو دِلوں سے جدا کرتی ہے۔ قطرہ قطرہ کر کے جب اُس نے اپنی زندگی کا سارا احساس چکا دیا تو اُسے محسوس ہوا کہ اُس کے پاس صرف یہی آدھ گھنٹہ بچا ہے، جو مکمل طور پر اُس کا اپنا تھا۔

مگر آدھ گھنٹہ تو بہت ہوتا ہے۔ وہ تو ایک طویل عرصہ ہوتا ہے۔ اس عرصے میں وہ بہت کچھ کر سکتا ہے۔ وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر آسمان سے گلے مل سکتا ہے۔ زمین پر کھلے ہوئے بسنتی پھولوں کو سونگھ سکتا ہے۔ ہوا میں اُڑتی ہوئی نازک بدن ابابیل اور زمین پر چلتی ہوئی کنواری ندی کو دیکھ سکتا ہے۔ اس آدھ گھنٹے میں وہ ایک پوری زندگی گزار سکتا ہے۔ آدھ گھنٹہ تو بہت ہوتا ہے۔

اور جب اُس نے یوں محسوس کیا تو ایسا لگا جیسے وہ ابھی پیدا ہوا ہے۔

یکا یک اُس کے سارے جسم سے درد نکل گیا۔ اُس نے اپنے آپ کو بالکل ایک نوزائیدہ بچّے کی طرح ہلکا پھلکا اور معصوم محسوس کیا۔ یکا یک اُس کا جی چاہا کہ وہ بانہیں پھیلا کر زور سے قہقہہ لگائے۔ ایسا خوش نصیب آدھ گھنٹہ کس کی زندگی میں آیا ہوگا۔ شروع سے آخر تک اُس کا اپنا اُس کے آغاز سے انجام تک مکمل باخبر۔ اس آدھ گھنٹہ میں وہ اپنی تقدیر پر پوری طرح قادر تھا وہ اس آدھ گھنٹے کا خدا تھا۔

مسرّت کی ایک لہر اُس کے دل میں دوڑ گئی۔ اُس نے بڑے اطمینان سے اپنی ٹانگیں پسار دیں۔ اپنے جسم کو بالکل ڈھیلا چھوڑ دیا اور دونوں آنکھیں بند کر کے موگری کے بھائیوں کا انتظار کرنے لگا۔

(ماخوذ از 'شاعر')

◆◆◆

پشاور ایکسپریس

جب میں پشاور سے چلی تو میں نے چھکا چھک اطمینان کا سانس لیا۔ میرے ڈبوں میں زیادہ تر ہندو لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ لوگ پشاور سے ہوتی مردان سے، کوہاٹ سے، چارسدہ سے،، خیبر سے، لنڈی کوتل سے، بنوں نوشہرہ، مانسہرہ سے آئے تھیاور پاکستان میں جان و مال محفوظ نہ پا کر ہندوستان کا رُخ کر رہے تھے۔ اسٹیشن پر زبردست پہرہ تھا اور فوج والے بڑی چوکسی سے کام کر رہے تھے۔ ان لوگوں کو جو پاکستان میں پناہ گزین اور ہندوستان میں شرنارتھی کہلاتے تھے، اُس وقت تک چین کا سانس نہ آیا جب تک میں نے پنجاب کی رومان خیز سرزمین کی طرف قدم نہ بڑھائے۔ یہ لوگ شکل وصورت سے بالکل پٹھان معلوم ہوتے تھے، گورے چٹے، مضبوط ہاتھ پاؤں، سر پر کلاہ اور لنگی اور جسم پر قمیص اور شلوار۔ یہ لوگ پشتو میں بات کرتے تھے اور کبھی کبھی نہایت کرخت قسم کی پنجابی میں بات چیت کرتے تھے۔ ان کی حفاظت کے لیے ہر ڈبے میں دو سپاہی بندوقیں لے کر کھڑے تھے۔ وجیہ بلوچی سپاہی۔ اپنی پگڑیوں کے عقب میں مور کی چھتر کی طرح خوبصورت طرّے لگائے ہوئے۔ ہاتھ میں جدید رائفلیں لیے ہوئے۔ ان ہندو پٹھانوں اوران کے بیوی بچوں کی طرف مسکرا مسکرا کر دیکھتے تھے۔ جو ایک تاریخی خوف اور شر کے زیر اثر اس سرزمین سے بھاگے جا رہے تھے۔ جہاں وہ ہزاروں سال سے رہتے چلے آئے تھے۔ جس کی سنگلاخ سرزمین سے انھوں نے توانائی حاصل کی تھی، جس کے برفاب چشموں سے انھوں نے پانی پیا تھا اور جس کے حسین چمن زاروں سے انھوں نے انگوروں کا رس پیا تھا۔ آج یہ وطن یک لخت بیگانہ ہو گیا تھا۔ اور اُس نے اپنے مہربان سینے کے کواڑ اُن پر بند کر دیے تھے۔ وہ ایک نئے دیس کے تپتے ہوئے میدانوں کا تصور دل میں لیے بادلِ نخواستہ وہاں سے رخصت ہو رہے تھے۔ اس

امر کی مسرت ضرور تھی کہ ان کی جانیں بچ گئی تھیں اور ان کی بہوؤں، بیٹیوں، ماؤں اور بیویوں کی آبرو محفوظ تھی لیکن اُن کا دل رو رہا تھا اور آنکھیں سرحد کے پتھریلے سینے پر یوں گڑی ہوئی تھیں، گویا اُسے چیر کر اندر گھس جانا چاہتی تھیں اور اُس کے شفقت بھرے مامتا کے فوارے سے پوچھنا چاہتی ہیں...... بول ماں! آج کس جرم کی پاداش میں تو نے اپنے بیٹوں کو گھر سے نکال دیا ہے؟ اپنی بہوؤں کو اس خوبصورت آنگن سے محروم کیا ہے جہاں وہ کل تک سہاگ کی رانیاں بنی بیٹھی تھیں۔ اپنی البیلی کنواریوں کو جو انگور کی بیل کی طرح تیری چھاتی سے لپٹ رہی تھیں، جھنجھوڑ کر الگ کر دیا ہے۔ کس لیے آج یہ دیس بدیس ہو گیا ہے؟ میں چلتی جا رہی تھی اور ڈبوں میں بیٹھی ہوئی مخلوق اپنے وطن کی سطح مرتفع، اُس کی بلند و بالا چٹانوں، اُس کے مرغزاروں، اُس کی شاداب وادیوں، کنجوں اور باغوں کی طرف یوں دیکھ رہی تھی جیسے ہر جانے پہچانے منظر کو اپنے سینے میں چھپا کے لے جانا چاہتی ہے، جیسے نگاہ ہر لحظہ رُک جائے اور مجھے ایسے معلوم ہوا کہ اس عظیم رنج و الم کے بارے میں میرے قدم بھاری ہوئے جا رہے ہیں اور ریل کی پٹڑی مجھے جواب دیے جا رہی ہے۔ حسن ابدال تک لوگ یوں ہی محزوں و افسردہ، یاس و نکبت کی تصویر بنے رہے۔ حسن ابدال کے اسٹیشن پر بہت سے سکھ آئے ہوئے تھے۔ پنجہ صاحب سے لمبی لمبی کرپانیں لیے، چہرے پر ہوائیاں، بال بچے سہمے سہمے سے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اپنی ہی تلوار کے گھاؤ سے یہ لوگ خود مر جائیں گے۔ ڈبوں میں بیٹھ کر ان لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا اور پھر دوسری سرحد کے ہندو سکھ پٹھانوں سے گفتگو شروع ہو گئی، کسی کا گھر بار جل گیا تھا، کوئی صرف ایک قمیص اور شلوار میں بھاگا تھا۔ کسی کے پاؤں میں جوتی نہ تھی اور کوئی اتنا ہوشیار تھا کہ اپنے گھر کی ٹوٹی چارپائی تک اُٹھا لایا تھا۔ جن لوگوں کا واقعی بہت نقصان ہوا تھا وہ لوگ گم صم بیٹھے تھے۔ خاموش، چُپ چاپ اور جس کے پاس کبھی کچھ نہ ہوا تھا، وہ اپنی لاکھوں کی جائیداد کے کھونے کا غم کر رہا تھا اور دوسروں کو اپنی فرضی امارت کے قصے سُنا سُنا کر مرعوب کر رہا تھا اور مسلمانوں کو گالیاں دے رہا تھا۔ بلوچی سپاہی ایک پُر وقار انداز میں دروازوں پر رائفلیں تھامے کھڑے تھے اور کبھی کبھی ایک دوسرے کی طرف کنکھیوں سے دیکھ کر مسکرا اُٹھتے۔

ٹیکسلا کے اسٹیشن پر مجھے بہت عرصے تک کھڑا رہنا پڑا۔ نہ جانے کس کا انتظار تھا۔ شاید آس پاس کے گاؤں سے ہندو پناہ گزین آ رہے تھے۔ جب گارڈ نے اسٹیشن ماسٹر سے بار بار پوچھا تو اُس نے کہا۔ یہ گاڑی آ۔گے نہ جا سکے گی۔ ایک گھنٹہ اور گزر گیا۔ اب لوگوں نے اپنا سامان

خورد ونوش کھولا اور کھانے لگے۔ سہمے سہمے بچے قہقہے لگانے لگے اور معصوم کنواریاں دریچوں سے باہر جھانکنے لگیں اور بڑے بوڑھے حقے گڑگڑانے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد دُور سے شور سنائی دیا اور ڈھولوں کے پیٹنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ہندو پناہ گزینوں کا جتھا آ رہا تھا شاید۔ لوگوں نے سر نکال کر اِدھر اُدھر دیکھا، جتھا دُور سے آ رہا تھا اور نعرے لگا رہا تھا۔ وقت گزرتا گیا، جتھا قریب آ گیا۔ ڈھولوں کی آواز تیز تر ہوتی گئی۔ جتھے کے قریب آتے ہی گولیوں کی آواز کانوں میں آئی اور لوگوں نے اپنے سر کھڑکیوں سے پیچھے ہٹا لیے۔ یہ ہندوؤں کا جتھا تھا جو آس پاس کے گاؤں سے آیا تھا۔ گاؤں کے مسلمان لوگ اسے اپنی حفاظت میں لا رہے تھے، چنانچہ ہر ایک مسلمان نے ایک کافر کی لاش اپنے کندھے پر اُٹھا رکھی تھی۔ جس نے جان بچا کر گاؤں سے بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ دو سو لاشیں تھیں۔ مجمع نے یہ لاشیں نہایت اطمینان سے اسٹیشن پر پہنچ کر بلوچی دستے کے سپرد کیں اور کہا کہ ان مہاجرین کو نہایت حفاظت سے ہندوستان کی سرحد پر لے جائے چنانچہ بلوچی سپاہیوں نے نہایت خندہ پیشانی سے اس بات کا ذمہ لیا اور ہر ڈبے میں پندرہ بیس لاشیں رکھ دی گئیں۔ اس کے بعد مجمع نے ہوا میں فائر کی اور گاڑی چلانے کے لیے اسٹیشن ماسٹر کو حکم دیا۔ میں چلنے لگی تھی کہ پھر مجھے روک دیا گیا اور مجمع کے سرغنے نے ہندو پناہ گزینوں سے کہا کہ دو سو آدمیوں کے چلے جانے سے اُن کے گاؤں ویران ہو جائیں گے اور ان کی تجارت تباہ ہو جائے گی اس لیے وہ گاڑی میں سے دو سو آدمی اُتار کر اپنے گاؤں لے جائیں گے، چاہے کچھ بھی ہو۔ وہ اپنے ملک کو یوں برباد ہوتا ہوا نہیں دیکھ سکتے۔ اس پر بلوچی سپاہیوں نے اُن کی فہم وذکا اور اُن کی فراستِ طبع کی داد دی، اُن کی وطن پرستی کو سراہا چنانچہ بلوچی سپاہیوں نے کچھ آدمی نکال کر مجمع کے حوالے کیے۔ پورے دو سو آدمی نکالے گئے ایک کم نہ ایک زیادہ۔

لائن لگاؤ کافرو! سرغنے نے کہا۔ سرغنہ اپنے علاقے کا سب سے بڑا جاگیردار تھا اور اپنے لہو کی روانی میں مقدس جہاد کی گونج سُن رہا تھا۔ کافر پتھر کے بُت بنے کھڑے تھے۔ مجمع کے لوگوں نے انھیں اُٹھا اُٹھا کر لائن میں کھڑا کیا۔ دو سو آدمی، دو سو زندہ لاشیں، چہرے ستے ہوئے، آنکھیں فضا میں تیروں کی بارش محسوس کرتی ہوئی۔ پہل بلوچی سپاہیوں نے کی۔ پندرہ آدمی فائرنگ سے گر گئے۔ یہ ٹیکسلا کا اسٹیشن تھا۔

بیس اور آدمی گر گئے۔

یہاں ایشیا کی سب سے بڑی یونیورسٹی تھی اور لاکھوں طالب علم اس تہذیب وتمدن کے

گہوارے سے کسبِ فیض کرتے تھے۔

پچاس اور مارے گئے۔

ٹیکسلا کے عجائب گھر میں اتنے خوبصورت بُت تھے، اتنے حسین سنگ تراشی کے نادر نمونے، قدیم تہذیب کے جھلملاتے چراغ۔ پچاس اور مارے گئے۔ پس منظر میں سرکوپ کا محل تھا اور کھیلوں کا امفی تھیٹر اور میلوں تک پھیلے ہوئے ایک وسیع شہر کے کھنڈرات۔ ٹیکسلا کی گزشتہ عظمت کے پُرشکوہ مظہر۔

تیس اور مارے گئے۔ یہاں کنشک نے حکومت کی تھی اور لوگوں کو امن و آشتی اور حسن و دولت سے مالا مال کیا تھا۔

پچیس اور مارے گئے۔ یہاں بدھ کا نغمۂ عرفاں گونجا تھا۔ یہاں بھکشوؤں نے امن، صلح و آشتی کا درس دیا تھا۔

اب آخری گروہ کی اجل آگئی تھی۔ یہاں پہلی بار ہندوستان کی سرحد پر اسلام کا پرچم لہرایا تھا۔ مساوات اور اخوت اور انسانیت کا پرچم۔ سب مر گئے۔ اللہ اکبر۔ فرش خون سے لال تھا اور جب میں پلیٹ فارم سے گزری تو میرے پاؤں ریل کی پٹری سے پھسلے جاتے تھے۔ جیسے میں ابھی گر جاؤں گی اور گر کر باقی ماندہ مسافروں کو بھی ختم کر دوں گی۔

ہر ڈبے میں موت آگئی تھی اور لاشیں درمیان میں رکھ دی گئی تھیں اور زندہ لاشوں کا ہجوم چاروں طرف تھا اور بلوچی سپاہی مسکرا رہے تھے۔ کہیں کوئی بچہ رونے لگا۔ کسی بوڑھی ماں نے سسکی لی۔ کسی کے لٹے ہوئے سہاگ نے آہ کی اور میں چیختی چلاتی راولپنڈی کے پلیٹ فارم پر آکھڑی ہوئی۔

یہاں سے کوئی پناہ گزین گاڑی میں سوار نہ ہوا۔ ایک ڈبے میں چند مسلمان نوجوان پندرہ بیس برقع پوش عورتوں کو لے کر سوار ہوئے۔ ہر نوجوان رائفل سے مسلح تھا۔ ایک ڈبے میں بہت سا سامانِ جنگ لادا گیا۔ مشین گنیں اور کارتوس، پستول اور رائفلیں۔

جہلم اور گوجر خان کے درمیانی علاقے میں مجھے سگنل کھینچ کر کھڑا کر دیا گیا۔ میں رُک گئی۔ مسلح نوجوان گاڑی سے اُترنے لگے۔ برقع پوش خواتین نے شور مچانا شروع کیا۔ ہم ہندو ہیں، ہم سکھ ہیں۔ ہمیں زبردستی لے جا رہے ہیں۔ انھوں نے برقعے پھاڑ دیے اور چلانے لگیں۔ نوجوان مسلمان ہنستے ہوئے انھیں گھسیٹ کر گاڑی سے نکال لائے۔ ہاں یہ ہندو عورتیں ہیں۔ ہم انھیں

راولپنڈی سے اُن کے آرام دہ گھروں، اُن کے خوشحال گھرانوں، اُن کے عزت دار ماں باپ سے چھین کر لائے ہیں۔ اب یہ ہماری ہیں۔ ہم ان کے ساتھ جو چاہے سلوک کریں گے۔ اگر کسی میں ہمت ہے تو انھیں ہم سے چھین کر لے جائے۔

سرحد کے دو نوجوان ہندو پٹھان چھلانگ مار کر گاڑی سے اُتر گئے۔ بلوچی سپاہیوں نے نہایت اطمینان سے فائر کر کے انھیں ختم کر دیا۔ پندرہ بیس نوجوان اور نکلے۔ انھیں مسلح مسلمانوں کے گروہ نے منٹوں میں ختم کر دیا۔ دراصل گوشت کی دیوار لوہے کی گولی کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ نوجوان ہندو عورتوں کو گھسیٹ کر جنگل میں لے گئے اور میں منہ چھپا کر وہاں سے بھاگی۔ کالا، خوفناک سیاہ دھواں میرے منہ سے نکل رہا تھا۔ جیسے کائنات پر خباثت کی سیاہی چھا گئی تھی اور سانس میرے سینے میں یوں اُلجھنے لگا جیسے یہ آہنی چھاتی ابھی پھٹ جائے گی اور اندر بھڑکتے ہوئے لال لال شعلے اس جنگل کو خاک کر ڈالیں گے، جو اس وقت میرے آگے پیچھے پھیلا ہوا تھا اور جس نے ان پندرہ عورتوں کو چشم زدن میں نگل لیا تھا۔ لالہ موسیٰ کے قریب لاشوں سے اتنی مکروہ سڑاند نکلنے لگی کہ بلوچی سپاہی انھیں باہر پھینکنے پر مجبور ہو گئے۔ وہ ہاتھ کے اشارے سے ایک آدمی کو بلاتے اور اُس سے کہتے۔ اس لاش کو اُٹھا کر یہاں لاؤ دروازے پر اور جب وہ آدمی ایک لاش اُٹھا کر دروازے پر لاتا تو وہ اُسے گاڑی سے باہر دھکا دے دیتے۔ تھوڑی دیر میں سب لاشیں ایک ایک ہمراہی کے ساتھ باہر پھینک دی گئیں اور ڈبوں میں آدمی کم ہو جانے سے ٹانگیں پھیلانے کی جگہ بھی ہو گئی۔ پھر لالہ موسیٰ گزر گیا اور وزیر آباد آ گیا۔

وزیر آباد کا مشہور جنکشن۔ وزیر آباد کا مشہور شہر جہاں ہندوستان بھر کے لیے چھریاں اور چاقو تیار ہوتے ہیں۔ وزیر آباد جہاں کے ہندو اور مسلمان صدیوں سے بیساکھی میلہ بڑی دھوم دھام سے مناتے ہیں اور اس کی خوشیوں میں اکٹھے حصہ لیتے ہیں۔ وزیر آباد کا اسٹیشن لاشوں سے پٹا ہوا ہے۔ شاید یہ لوگ بیساکھی کا میلہ دیکھنے آئے تھے لاشوں کا میلہ۔ شہر میں دھواں اُٹھ رہا تھا اور اسٹیشن کے قریب انگریزی بینڈ کی صدا سنائی دے رہی تھی اور ہجوم کی پُر شور تالیوں اور قہقہوں کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ چند منٹوں میں ہجوم اسٹیشن پر آ گیا۔ آگے آگے دیہاتی ناچتے گاتے آ رہے تھے اور اُن کے پیچھے ننگی عورتوں کا ہجوم تھا۔ مادر زاد ننگی عورتیں، بوڑھی، نوجوان بچیاں، دادیاں اور پوتیاں، مائیں اور بہوئیں اور بیٹیاں، کنواری اور حاملہ عورتیں، ناچتے، گاتے ہوئے مردوں کے نرغے میں تھیں۔ عورتیں ہندو اور سکھ تھیں اور مرد مسلمان اور دونوں نے مل کر یہ

عجیب بیساکھی منائی تھی۔ عورتوں کے بال کھلے ہوئے تھے۔ اُن کے جسموں پر زخموں کے نشان تھے اور وہ اس طرح سیدھی تن کر چل رہی تھیں جیسے ہزار کپڑوں میں ان کے جسم چھپے ہوں، جیسے اُن کی روحوں پر سکون آمیز موت کے دبیز سائے چھا گئے ہوں۔ اُن کی نگاہوں کا جلال دروپدی کو بھی شرماتا تھا اور ہونٹ دانتوں کے اندر یوں بھینچے ہوئے تھے گویا کسی مہیب لاوے کا منہ بند کیے ہوئے ہیں۔ شاید ابھی یہ لاوا پھٹ پڑے گا اور اپنی آتش فشانی سے دنیا کو جہنم بنا دے گا۔ مجمع میں سے آوازیں آئیں: ''پاکستان زندہ باد''

اسلام زندہ باد۔ قائداعظم محمد علی جناح زندہ باد۔

ناچتے تھرکتے ہوئے قدم پرے ہٹ گئے اور اب عجیب و غریب ہجوم ڈبوں کے عین سامنے تھا۔ ڈبوں میں بیٹھی ہوئی عورتوں نے گھونگھٹ کاڑھ لیے اور ڈبے کی کھڑکیاں یکے بعد دیگرے بند ہونے لگیں۔ بلوچی سپاہیوں نے کہا۔ کھڑکیاں مت بند کرو۔ ہوا رکتی ہے۔ کھڑکیاں بند ہوتی گئیں۔ بلوچی سپاہیوں نے بندوقیں تان لیں، ٹھائیں ٹھائیں۔ پھر بھی کھڑکیاں بند ہوتی گئیں اور پھر ڈبے میں ایک کھڑکی بھی کھلی نہ رہی ہاں کچھ پناہ گزین ضرور مر گئے تھے۔

ننگی عورتیں پناہ گزینوں کے ساتھ بٹھا دی گئیں اور میں اسلام زندہ باد اور قائداعظم محمد علی جناح زندہ باد کے نعروں کے درمیان رخصت ہوئی۔

گاڑی میں بیٹھا ہوا ایک بچہ لڑھکتا لڑھکتا ایک بوڑھی دادی کے پاس چلا گیا اور اُس سے پوچھنے لگا۔ ''ماں تم نہا کے آئی ہو؟''

دادی نے اپنے آنسوؤں کو روکتے ہوئے کہا۔ ہاں ننھے آج مجھے میرے وطن کے بیٹوں، میرے بیٹوں نے نہلایا ہے۔

تمھارے کپڑے کہاں ہیں ماں!

ان پر میرے سہاگ کے چھینٹے تھے بیٹا! وہ لوگ انھیں دھونے کے لیے لے گئے ہیں۔ دو ننگی لڑکیوں نے گاڑی سے چھلانگ لگا دی اور میں چیختی چلاتی آگے بھاگی اور لاہور پہنچ کر دم لیا۔

مجھے نمبر ایک پلیٹ فارم پر کھڑا کیا گیا۔ نمبر ۲ پلیٹ فارم پر دوسری گاڑی کھڑی تھی۔ یہ امرتسر سے آئی تھی اور اس میں مسلمان پناہ گزین بند تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد مسلم خدمت گار میرے ڈبوں کی تلاشی لینے لگے اور زیور اور نقدی اور دوسرا قیمتی سامان مہاجرین سے لے لیا گیا۔ اس کے بعد چار سو آدمی ڈبوں سے نکال کر اسٹیشن پر کھڑے کیے تھے۔ یہ مذبح کے بکرے

تھے کیونکہ ابھی ابھی نمبر ۲ پلیٹ فارم پر جو مسلم مہاجرین کی گاڑی آکے رُکی تھی، اُس میں چار سو مسلمان مسافر کم تھے اور پچاس عورتیں اغوا کر لی گئی تھیں، اس لیے یہاں پر بھی پچاس عورتیں چُن چُن کر نکال لی گئیں اور چار سو ہندو مسافروں کو تہ تیغ کیا گیا تا کہ ہندوستان اور پاکستان میں آبادی کا توازن برقرار رہے۔

مسلم خدمت گاروں نے ایک دائرہ بنا رکھا تھا اور چھرے ہاتھ میں تھے اور دائرے میں باری باری ایک مہاجر اُن کے چھرے کی زد میں آتا تھا اور بڑی چابک دستی اور مشاقی سے ہلاک کر دیا جاتا تھا۔ چند منٹوں میں چار سو آدمی ختم کر دیے گئے اور پھر میں آگے چلی۔ اب مجھے اپنے جسم کے ذرے ذرے سے گھن آنے لگی تھی۔ اس قدر پلید اور متعفن محسوس کر رہی تھی میں، جیسے مجھے شیطان نے سیدھا جہنم سے دھکا دے کر پنجاب میں بھیج دیا ہو۔ اٹاری پہنچ کر فضا بدل سی گئی۔ مغل پورہ ہی سے بلوچی سپاہی بدلے گئے اور ان کی جگہ ڈوگروں اور سکھ سپاہیوں نے لے لی تھی لیکن اٹاری پہنچ کر تو مسلمانوں کی اتنی لاشیں ہندو مہاجرین نے دیکھیں کہ ان کے دل فرطِ مسرت سے باغ باغ ہو گئے۔ آزاد ہندوستان کی سرحد آگئی تھی ورنہ اتنا حسین منظر کس طرح دیکھنے کو ملتا؟ اور جب میں امرتسر ریلوے اسٹیشن پر پہنچی تو سکھوں کے نعروں نے زمین آسمان کو گونجا دیا۔ یہاں بھی مسلمانوں کی لاشوں کے ڈھیر تھے اور ہندو جاٹ اور سکھ اور ڈوگرے ہر ڈبے میں جھانک کر پوچھتے جاتے تھے۔ ''کوئی شکار ہے؟'' مطلب یہ کہ کوئی مسلمان ہے۔

ایک ڈبے میں چار ہندو براہمن سوار ہوئے۔ سر گھٹا ہوا۔ لمبی چوٹی، رام نام کی دھوتی باندھے ہری دوار کا سفر کر رہے تھے۔ یہاں ہر ڈبے میں آٹھ دس سکھ اور جاٹ بھی بیٹھ گئے۔ یہ لوگ رائفلوں اور بلموں سے مسلح تھے اور مشرقی پنجاب میں شکار کی تلاش میں جا رہے تھے۔ ان میں سے ایک کے دل میں کچھ شبہ پیدا ہوا۔ اُس نے ایک براہمن سے پوچھا:

براہمن دیوتا کدھر جا رہے ہیں؟

ہری دوار۔ تیرتھ کرنے۔

ہری دوار جا رہے ہو کہ پاکستان جا رہے ہو؟

میاں اللہ اللہ کرو۔ دوسرے براہمن کے منہ سے نکلا۔

جاٹ ہنسا۔ تو آؤ اللہ اللہ کریں۔ او نتھا سہاں! شکار مل گیا۔ بھئی آؤ ہیدا اللہ بیلی کریئے۔ اتنا کہہ کر جاٹ نے بلم نقلی براہمن کے سینے میں مارا دوسرے براہمن بھاگنے لگے۔ جاٹوں نے انھیں

پکڑ لیا۔ ایسے نہیں براہمن دیوتا۔ ذرا ڈاکٹری معائنہ کراتے جاؤ۔ ہری دوار جانے سے پہلے ڈاکٹری معائنہ بہت ضروری ہے نا۔ ڈاکٹری معائنے سے مراد یہ تھی کہ وہ لوگ ختنہ دیکھتے تھے اور جس کے ختنہ ہوا ہوتا اُسے وہیں مار ڈالتے تھے۔ چاروں مسلمان جو براہمن کا روپ بدل کر اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ رہے تھے، وہیں مار ڈالے گئے اور میں آگے آگے چلی۔

راستے میں ایک جگہ جنگل میں مجھے یک لخت کھڑا کر دیا گیا اور لوگ یعنی مہاجرین اور سپاہی اور جاٹ اور سکھ سب نکل نکل کر جنگل کی طرف بھاگنے لگے۔ میں نے سوچا شاید مسلمانوں کی بہت بڑی فوج اُن پر حملہ کرنے کے لیے آ رہی ہے۔ اتنے میں کیا دیکھتی ہوں کہ جنگل میں بہت سارے مسلمان مزارع اپنی بیوی بچوں کو لیے چھپے بیٹھے ہیں۔ ست سری اکال اور ہندو دھرم کی جے کے نعروں کی گونج سے جنگل کانپ اُٹھا اور وہ لوگ نرغے میں لے لیے گئے۔ آدھ گھنٹے میں سب صفایا ہو گیا۔ بڈھے، جوان، عورتیں اور بچے سب مار ڈالے گئے۔ ایک جاٹ کے نیزے پر ایک ننھے سے بچے کی لاش تھی اور وہ اسے ہوا میں گھما گھما کر کہہ رہا تھا۔ آئی بیساکھی، آئی بیساکھی جٹا لائے ہے ہے .... جالندھر سے ادھر پٹھانوں کا ایک گاؤں تھا۔ یہاں پر گاڑی روک کر لوگ گاؤں میں گھس گئے۔ سپاہی اور مہاجرین اور جاٹ پٹھانوں نے مقابلہ کیا لیکن آخر میں مارے گئے۔ بچے اور مرد ہلاک ہو گئے۔ تو عورتوں کی باری آئی اور وہیں اسی کھلے میدان میں جہاں گیہوں کے کھلیان لگائے جاتے تھے اور سرسوں کے پھول مسکراتے تھے اور عفت مآب بیبیاں اپنے خاوندوں کی نگاہِ شوق کی تاب نہ لا کر کمزور شاخوں کی طرح جھکی جاتی تھیں اُسی وسیع میدان میں جہاں پنجاب کے دل نے ہیر رانجھے اور سوہنی مہینوال کی لافانی اُلفت کے ترانے گائے تھے، انھیں شیشم، سرس اور پیپل کے درختوں تلے وقتی چکلے آباد ہوئے۔ پچاس عورتیں اور پانسو مرد۔ پچاس بھیڑیں اور پانسو قصاب۔ پچاس سوہنیاں اور پانسو مہینوال۔ شاید اب چناب میں کبھی طغیانی نہیں آئے گی۔ شاید اب کوئی وارث شاہ کی ہیر نہیں گائے گا۔ شاید اب مرزا صاحباں کی داستان الفت و عفت ان میدانوں میں کبھی نہ گونجے گی۔ لاکھوں بار لعنت ہو ان رہنماؤں پر اور اُن کی آئندہ سات پشتوں پر۔ جنھوں نے اس خوبصورت پنجاب، اس البیلے پیارے، سنہرے پنجاب کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے تھے اور اس کی پاکیزہ روح کو گہنا دیا تھا اور اس کے مضبوط جسم میں نفرت کی پیپ بھر دی تھی۔ آج پنجاب مر گیا تھا۔ اُس کے نغمے گنگ ہو گئے تھے، اُس کے گیت مردہ، اُس کی زبان مردہ۔ اُس کا بے باک نڈر، بھولا بھالا دل مردہ اور نہ محسوس

کرتے ہوئے اور آنکھ اور کان نہ رکھتے ہوئے بھی میں نے پنجاب کی موت دیکھی اور خوف سے اور حیرت سے میرے قدم اُس پٹڑی پر رُک گئے۔

پٹھان مردوں اور عورتوں کی لاشیں اُٹھائے جاٹ اور سکھ اور ڈوگرے اور سرحدی ہندو واپس آئے اور میں آگے چلی۔ آگے ایک نہر آتی تھی۔ ذرا ذرا وقفے کے بعد میں روک دی جاتی۔ جونہی کوئی ڈبہ نہر کے پُل پر سے گزرتا، لاشوں کو عین نیچے نہر کے پانی میں گرا دیا جاتا۔ اس طرح جب ہر ڈبے۔ یے رُکنے کے بعد سب لاشیں پانی میں گرا دی گئیں تو لوگوں نے دیسی شراب کی بوتلیں کھولیں اور میں خون اور شراب اور نفرت کی بھاپ اُگلتی ہوئی آگے بڑھی۔

لدھیانہ پہنچ کر لٹیرے گاڑی سے اُتر گئے اور شہر میں جا کر مسلمانوں کے محلوں کا پتہ ڈھونڈ نکالا اور وہاں حملہ کیا اور لوٹ مار کی اور مال غنیمت اپنے کاندھوں پر لادے ہوئے تین چار گھنٹوں کے بعد اسٹیشن پر واپس آئے۔ جب تک لوٹ مار نہ ہو چکتی، جب تک دس بیس مسلمانوں کا خون نہ ہو چکتا، جب تک سب مہاجرین اپنی نفرت کو آلودہ نہ کر لیتے، میرا آگے بڑھنا دشوار کیا، ناممکن تھا۔ میری روح میں اتنے گھاؤ تھے اور میرے جسم کا ذرہ ذرہ گناہ سے ناپاک خونیوں کے قہقہوں سے اس طرح رچ گیا تھا کہ مجھے غُسل کی شدید ضرورت محسوس ہو رہی تھی لیکن مجھے معلوم تھا کہ اس سفر میں کوئی مجھے نہانے نہیں دے گا۔

انبالہ اسٹیشن پر رات کے وقت میرے ایک فرسٹ کلاس کے ڈبے میں ایک مسلمان ڈپٹی کمشنر اور اُس کی بیوی اور بچے سوار ہوئے۔ اسی ڈبے میں ایک سردار صاحب اور اُن کی بیوی بھی تھے۔ فوجیوں کے پہرے میں مسلمان ڈپٹی کمشنر کو گاڑی میں سوار کر دیا گیا اور فوجیوں کو اُن کی جان و مال کی حفاظت کی سخت تاکید کر دی گئی۔

رات کے دو بجے میں انبالے سے چلی اور دس میل آگے جا کر رُک گئی۔ فرسٹ کلاس کا ڈبہ اندر سے بند تھا اس لیے کھڑکی کے شیشے توڑ کر لوگ اندر گئے اور ڈپٹی کمشنر اور اُس کی بیوی اور اُس کے چھوٹے چھوٹے بچوں کو قتل کیا گیا۔ ڈپٹی کمشنر کی ایک نوجوان لڑکی تھی اور بہت خوبصورت۔ وہ کسی کالج میں پڑھتی تھی۔ دو ایک نوجوانوں نے سوچا اسے بچا لیا جائے۔ یہ حسن...... یہ رعنائی، یہ تازگی، یہ جوانی کس کے کام آسکتی ہے۔ اتنا سوچ کر انھوں نے جلدی سے لڑکی اور زیورات کے بکس کو سنبھالا اور گاڑی سے اُتر کر جنگل میں چلے گئے۔ لڑکی کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی۔

یہاں، یہ کانفرنس شروع ہوئی لڑکی کو چھوڑ دیا جائے یا مار دیا جائے۔

لڑکی نے کہا۔ مجھے مارتے کیوں ہو مجھے ہندو کرلو میں تمھارے مذہب میں داخل ہوئی جاتی ہوں۔ تم میں سے کوئی ایک مجھ سے بیاہ کرلے۔ میری جان لینے سے فائدہ؟

ٹھیک تو کہتی ہے میرے خیال میں...... دوسرے نے قطع کلام کرتے ہوئے اور لڑکی کے پیٹ میں چھرا بھونکتے ہوئے کہا۔ میرے خیال میں اسے ختم کردینا ہی بہتر ہے۔ چلو گاڑی میں واپس چلو۔ کیا کانفرنس لگا رکھی ہے تم نے؟

لڑکی جنگل میں گھاس کے فرش پر تڑپ تڑپ کر مرگئی۔ اُس کی کتاب اُس کے خون سے تر بتر ہوگئی۔ کتاب کا عنوان تھا۔ "اشتراکیت عمل اور فلسفہ" از جان سٹریچی۔" وہ ذہین لڑکی ہوگی۔ اُس کے دل میں اپنے ملک وقوم کی خدمت کے ارادے ہوں گے۔ اُس کی روح میں کسی سے محبت کرنے، کسی کو چاہنے، کسی کے گلے لگ جانے، کسی بچے کو دودھ پلانے کا جذبہ ہوگا۔ وہ لڑکی تھی، وہ ماں تھی، وہ بیوی تھی، وہ کسی کی محبوبہ تھی، وہ کائنات کی تخلیق کا مقدس راز تھی اور اب اس کی لاش جنگل میں پڑی تھی اور گیدڑ اور گدھ اور کوے اس کی لاش کو نوچ نوچ کر کھائیں گے۔

اشتراکیت، فلسفہ اور عمل۔ وحشی درندے انھیں نوچ نوچ کر کھا رہے تھے اور کوئی نہیں بولتا اور کوئی آگے نہیں بڑھتا اور کوئی عوام میں سے انقلاب کا دروازہ نہیں کھولتا اور میں رات کی تاریکی، آگ اور شراروں کو چھپا کے آگے بڑھ رہی ہوں اور میرے ڈبوں میں لوگ شراب پی رہے ہیں اور مہاتما گاندھی کی جے کارے بلا رہے ہیں۔

ایک عرصے کے بعد میں بمبئی واپس آئی ہوں۔ یہاں مجھے نہلا دھلا کر شیڈ میں رکھ دیا گیا ہے۔ میرے ڈبوں میں اب شراب کے بھپارے نہیں ہیں۔ خون کے چھینٹے نہیں ہیں۔ وحشی خونی قہقہے نہیں ہیں مگر رات کی تنہائی میں جیسے بھوت جاگ اُٹھتے ہیں۔ مردہ روحیں بیدار ہوجاتی ہیں اور زخمیوں کی چیخیں اور عورتوں کے بین اور بچوں کی پکار ہر طرف فضا میں گونجنے لگتی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ اب مجھے کبھی اس سفر پر نہ لے جائے۔ میں اس شیڈ سے باہر نکلنا نہیں چاہتی۔ میں اس خوفناک سفر پر دوبارہ نہیں جانا چاہتی۔ اب میں اُس وقت جاؤں گی جب میرے سفر پر دو طرفہ سنہرے گیہوں کے کھلیان لہرائیں گے اور سرسوں کے پھول جھوم جھوم کر پنجاب کے رسیلے اُلفت بھرے گیت گائیں گے اور کسان ہندو اور مسلمان دونوں مل کر کھیت کاٹیں گے، بیج بوئیں گے۔ ہرے ہرے کھیتوں میں نلائی کریں گے اور اُن کے دلوں میں مہر و وفا اور آنکھوں میں شرم اور روحوں میں عورتوں کے لیے پیار اور محبت کا جذبہ ہوگا۔

میں لکڑی کی ایک بے جان گاڑی ہوں لیکن پھر بھی میں چاہتی ہوں کہ اس خون اور گوشت اور نفرت کے بوجھ سے مجھے نہ لادا جائے۔ میں اناج زدہ علاقوں میں اناج ڈھوؤں گی، میں کوئلہ اور تیل اور لوہا لے کر کارخانوں میں جاؤں گی۔ میں کسانوں کے لیے نئے ہل اور نئی کھاد مہیا کروں گی۔ میں اپنے ڈبوں میں کسانوں اور مزدوروں کی خوشحال ٹولیاں لے کر جاؤں گی اور با عصمت عورتوں کی میٹھی نگاہیں اپنے مردوں کا دل ٹٹول رہی ہوں گی اور اُن کے آنچلوں میں ننھے مُنے خوبصورت بچوں کے چہرے کنول کے پھولوں کی طرح کھلے نظر آئیں گے اور وہ اس موت کو نہیں بلکہ آنے والی زندگی کو جھک کر سلام کریں گے۔ جب نہ کوئی ہندو ہوگا نہ مسلمان بلکہ سب محنت کش ہوں گے اور انسان!

(مجموعہ 'ہم وحشی ہیں': کتب پبلشرز، بمبئی)

◆◆◆

تائی ایسری

میں گرانٹ میڈیکل کالج کلکتہ میں ڈاکٹری کا فائنل کورس کر رہا تھا اور اپنے بڑے بھائی کی شادی پر چند روز کے لیے لاہور آ گیا تھا۔ یہیں شاہی محلے کے قریب کوچہ ٹھاکر داس میں جہاں ہمارا آبائی گھر تھا، میری ملاقات تائی ایسری سے ہوئی۔

تائی ایسری ہماری سگی تائی تو نہ تھیں لیکن ایسی تھیں کہ انھیں دیکھ کر ہر ایک کا جی انھیں تائی کہنے کے لیے بے قرار ہو جاتا۔ محلے کے باہر جب ان کا تانگہ آ کے رُکا اور کسی نے کہا کہ ''لو تائی ایسری آ گئیں۔'' تو بہت سے بڈھے جوان مرد اور عورتیں انھیں لینے کے لیے دوڑے۔ دو تین نے سہارا دے کر تائی ایسری کو تانگے سے اُتارا کیونکہ تائی ایسری فربہ اندام تھیں اور چلنے یا باتیں کرنے سے یا محض کسی کو دیکھنے سے اُن کی سانس پھولنے لگتی تھی۔ دو تین رشتہ داروں نے یک بارگی اپنی جیب سے تانگے کے کرائے کے پیسے نکالے مگر تائی ایسری نے اپنی پھولی ہوئی سانسوں میں ہنس کر سب سے کہہ دیا کہ وہ تو پہلے ہی تانگے والے کو کرائے کے پیسے دے چکی ہیں اور جب وہ یوں اپنی پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان باتیں کرتے کرتے ہنسیں تو مجھے بہت اچھی لگیں۔ دو تین رشتہ داروں کا چہرہ اُتر گیا اور انھوں نے اپنے پیسے جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔ ''یہ تُم نے کیا کیا تائی؟ ہمیں اتنی سی خدمت کا موقع بھی نہیں دیتی ہو؟'' اس پر تائی نے کچھ جواب نہیں دیا۔ انھوں نے اپنے قریب کھڑی ہوئی ایک نوجوان عورت سے پنکھی لے لی اور اُسے جھلتے ہوئے مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئیں۔

تائی ایسری کی عمر ساٹھ سے کم نہ ہوگی۔ اُن کے سر کے بال کھچڑی ہو چکے تھے اور اُن کے بھرے گول مٹول گندمی چہرے پر بہت اچھے لگتے تھے۔ اُن کا پھولی پھولی سانسوں میں معصوم

باتیں کرنا تو سب کو اچھا لگتا ہی تھا لیکن مجھے اُن کے چہرے میں اُن کی آنکھیں بڑی غیر معمولی نظر آئیں۔ اُن آنکھوں کو دیکھ کر مجھے ہمیشہ دھرتی کا خیال آیا ہے۔ میلوں دُور تک پھیلے کھیتوں کا خیال آیا ہے، کسی بڑی اور گہری دریائی بسیط چادرِ آب کا خیال آیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ خیال بھی آیا ہے کہ ان آنکھوں کے اندر جو محبت ہے، اُس کا کوئی کنارہ نہیں، جو معصومیت ہے اُس کا کوئی تھاہ نہیں، جو درد ہے اُس کا کوئی درماں نہیں۔

میں نے آج تک ایسی آنکھیں کسی عورت کے چہرے پر نہیں دیکھیں جو اس قدر وسیع اور بے کنار ہوں کہ زندگی کا بڑے سے بڑا اور تلخ سے تلخ تجربہ بھی اُن کے لیے ایک تنکے سے زیادہ حیثیت نہ رکھے، ایسی آنکھیں جو اپنی پہنائیوں میں سب کچھ بہا لے جائیں۔ ایسی انوکھی، معاف کر دینے والی، درگزر کر دینے والی آنکھیں میں نے آج تک نہیں دیکھیں۔

تائی ایسری نے کاسنی شاہی کا گھاگھرا پہن رکھا تھا جس پر سنہری گوٹے کا لہریا چمک رہا تھا۔ اُن کی قمیص بسنتی ریشم کی تھی۔ جس پر زری کے پھول کڑھے ہوئے تھے۔ سر پر دوہری ململ کا قرمزی دوپٹہ تھا۔ ہاتھوں میں سونے کے گوکھرو تھے۔ جب وہ گھر کے دالان میں داخل ہوئیں تو چاروں طرف شور مچ گیا۔ بہوئیں اور خالائیں اور نندیں اور بھاوجیں، موسیاں اور چچیاں سب تائی ایسری کے پاؤں چھونے کو دوڑیں۔ ایک عورت نے جلدی سے ایک رنگین پیڑھی کھینچ کر تائی ایسری کے لیے رکھ دی اور تائی ایسری ہنستے ہوئے اُس پر بیٹھ گئیں اور باری باری سے سب کو گلے لگا کر سب کے سر پر ہاتھ پھیر کر سب کو دعا دینے لگیں اور اُن کے قریب ہیرو مہری کی بیٹی سوتری خوشی سے اپنی باچھیں کھلائے زور زور سے پنکھا جھل رہی تھی۔ تائی ایسری گھر سے رنگین پچھی کی ایک ٹوکری لے کر آئی تھیں جو اُن کے قدموں میں اُن کی پیڑھی کے پاس ہی پڑی تھی۔ وہ باری باری سب کو دعائیں دیتی جاتیں اور پچھی والی ٹوکری کھول کر اُس میں سے ایک چونّی نکال کر دیتی جاتیں۔ کوئی ایک سو چونّیاں انھوں نے اگلے بیس منٹ میں بانٹ دی ہوں گی۔ جب سب عورتیں اور مرد، لڑکے اور بچے بالے اُن کے پاؤں چھو کر اپنی اپنی چونّی لے چکے تو انھوں نے اپنی ٹھوڑی اُونچی کر کے پنکھا جھلنے والی لڑکی کی طرف دیکھا اور اُس سے پوچھا:

"تو کون ہے؟"

"میں سوتری ہوں۔" بچی نے شرماتے ہوئے جواب دیا۔

"آئے ہائے تو جے کشن کی لڑکی ہے۔ میں تو بھول ہی گئی تھی تجھے۔ آ جا گلے سے لگ

جا......"

تائی ایسری نے اُسے گلے سے لگالیا بلکہ اُس کا منہ بھی چوم لیا اور جب انھوں نے اُسے پچھی والی ٹوکری سے نکال کر چونی دی تو گھر کی ساری عورتیں قہقہہ مار کر ہنس پڑیں اور موسی کرتار و اپنی نیلم کی انگوٹھی والی اُنگلی نچا کر بولی۔ "تائی یہ تو جے کشن کی بیٹی سوتری نہیں ہے، یہ تو ہیرو مہری کی بیٹی سوتری ہے۔"

"ہائے میں مرگئی!" تائی ایسری ایک دم گھبرا کر بولیں اور اُن کی سانس پھول گئی۔ "ہائے اب تو مجھے نہانا پڑے گا۔ میں نے تو اس کا منہ چوم لیا۔ اب میں کیا کروں؟"

تائی ایسری نے اپنی بڑی بڑی حیران نگاہوں سے مہری کی بیٹی سوتری کی طرف دیکھا جو اب اس طرح دھتکارے جانے پر سسکیاں لینے لگی تھی۔ یکا یک تائی کو اُس پر رحم آ گیا۔ انھوں نے پھر اُسے بانہہ سے پکڑ لیا اور چمٹا لیا۔ "نہ نہ تو کیوں روتی ہے۔ تُو تو انجان ہے۔ تُو تو دیوی ہے۔ تُو تو کنواری ہے۔ تیرے من میں تو پرمیشور بستے ہیں! تُو کیوں روتی ہے؟ مجھے تو اپنے دھرم کے کارن نہانا پڑے گا۔ پر تُو کیوں روتی ہے؟...... لے...... ایک چونی اور لے......"

تائی ایسری نے اُسے دوسری چونی دی۔ دوسری چونی پا کر مہری کی بیٹی سوتری اپنے آنسو پونچھ کر مسکرانے لگی۔ تائی ایسری نے ایک بازو اُٹھا کر پرے دالان میں گزرتی ہوئی ہیرو مہری کو دیکھ کر بلند آواز میں کہا:

"نی ہیرو! میرے اشنان کے لیے پانی رکھ دے۔ تجھے بھی ایک چونی دوں گی"

اس پر محفل پھر لوٹ پوٹ ہوگئی۔

تائی ایسری کو کئی لوگ چونی والی تائی کہتے تھے کیونکہ یہ بھی مشہور تھا کہ جس دن سے تایا یودھ راج نے تائی ایسری سے شادی کی تھی اُس دن سے آج تک وہ کنواری کی کنواری چلی آ رہی تھیں کیونکہ سنانے والے تو یہ بھی سُناتے ہیں کہ تایا یودھ راج نے اپنی شادی سے پہلے جوانی میں اتنی خوبصورت عورتیں دیکھ ڈالی تھیں کہ جب اُن کی شادی گاؤں کی اس سیدھی سادی لڑکی سے ہوئی تو شادی کے پہلے روز ہی وہ انھیں بالکل پسند نہ آئیں۔ جب سے انھوں نے شادی کر کے بالکل چھوڑ دیا تھا مگر کسی طرح کی سختی نہیں کرتے تھے۔ تایا یودھ راج ہر ماہ پچھتر روپے انھیں بھیجتے تھے۔ وہ گاؤں میں رہتی تھیں اپنی سسرال والوں کے ہاں...... اور سب کی خدمت کرتی تھیں اور تایا یودھ راج جالندھر میں لوہے کا بیوپار کرتے تھے اور کئی کئی سال اپنے گاؤں میں نہیں جاتے

تھے۔ میکے والوں نے کئی بار آ کر تائی کو لے جانا چاہا مگر انھوں نے انکار کر دیا۔ میکے والوں نے یہ بھی چاہا کہ اُن کی شادی پھر سے کر دی جائے مگر تائی اس کے لیے بھی راضی نہ ہوئیں۔ وہ اس انہماک سے اپنی سسرال کے لوگوں کی خدمت کرتی رہیں کہ سسرال والے خود انھیں اپنی بیٹی اور بہو سے زیادہ چاہنے لگے۔ تایا یودھ راج کے باپ مالک چند نے تو اپنے گھر کی ساری چابیاں تائی ایسری کے سپرد کر دی تھیں اور ساس بھی اس حد تک چاہنے لگی تھیں کہ انھوں نے اپنے سارے گہنے پاتے نکال کر تائی ایسری کی تحویل میں دے دیے تھے۔ ویسے بہت سی عورتوں کو دیکھ کر یہ خیال بھی آتا ہے کہ تائی ایسری شاید بچپن سے بلکہ جنم ہی سے ایسی پیدا ہوئی ہوں گی۔ پیدا ہوتے ہی انھوں نے اپنی ماں کو ہاتھ پھیلا کر آشیرواد دی ہوگی اور شاید بڑے میٹھے مہربان لہجے میں یہ بھی کہا ہو۔ ''تجھے میرے لیے بہت دکھ اُٹھانے پڑے اس لیے یہ لیجیے ایک چونی!''

شاید اسی لیے اپنے شوہر سے بھی اُن کے تعلقات بہت خوشگوار تھے۔ تایا یودھ راج ہمارے رشتہ داروں کی نظر میں شرابی کبابی، رنڈی باز تھے۔ وہ لوہے کے بیوپاری تھے تو کیا ہوا۔ انھیں اس طرح سے تائی ایسری کی زندگی برباد کرنا نہ چاہیے تھی مگر جانے کیا بات تھی، تائی ایسری کو قطعاً اپنی زندگی برباد ہونے کا کوئی غم نہ تھا۔ ان کے طرزِ عمل سے معلوم ہوتا تھا کہ انھیں اس بات کا بھی علم نہیں ہے کہ کسی نے اُن کی زندگی برباد کی ہے۔ ہر وقت ہنستی کھیلتی باتیں کرتیں۔ ہر ایک کے سکھ اور دکھ میں شامل ہونے اور خدمت کرنے کے لیے تیار نظر آتیں۔ یہ تو بالکل ناممکن تھا کہ پڑوس میں کسی کے ہاں خوشی ہو اور وہ اُس میں شریک نہ ہوں۔ کسی کے ہاں کوئی غم ہو اور وہ اُس میں حصہ نہ بٹائیں۔ تائی ایسری کے شوہر امیر تھے مگر وہ خود تو امیر نہ تھیں۔ پچھتر روپے جو انھیں ماہوار ملتے تھے وہ انھیں ہمیشہ دوسروں پر خرچ کر دیتی تھیں مگر وہ سستے زمانے کے پچھتر روپے تھے اس لیے بہت سے لوگوں کے دکھ درد دُور ہو جاتے تھے مگر لوگ اُن سے اُن کی وقت بے وقت کی مدد کی وجہ سے پیار نہیں کرتے تھے، ایسے بہت سے موقعے آتے تھے جب تائی ایسری کی جیب میں چھدام تک نہ ہوتا تھا۔ اُس وقت بھی لوگ بے مزہ نہ ہوتے تھے بلکہ یہی کہتے سُنے گئے کہ تائی ایسری کے تو چرن چھو لینے ہی سے دل کو شانتی مل جاتی ہے۔

مگر جتنی اچھی تائی ایسری تھیں تایا یودھ راج اُتنے ہی بُرے تھے۔ تیس برس تک تو انھوں نے تائی ایسری کو اپنے ماں باپ کے گھر ہی میں رکھا اور جب اُن کے ماں اور باپ فوت ہو گئے اور گھر خالی ہو گیا، گھر کے دوسرے افراد بڑے ہو گئے اور شادیاں کر کے اور گھر بسا کے دوسری

جگھوں پر چلے گئے تو انھیں بادلِ نخواستہ تائی ایسری کو بھی جالندھر بلوانا پڑا مگر یہاں تائی ایسری چند دنوں سے زیادہ نہ رہ سکیں کیونکہ پکا باغ کے معزز پٹھانوں کی ایک لڑکی سے تایا یودھ راج نے یارانہ گانٹھنے کی کوشش کی تھی، نتیجے میں انھیں جالندھر سے بھاگ کر لاہور آنا پڑا کیونکہ پکا باغ کے پٹھانوں نے آکر تائی ایسری سے کہہ دیا تھا کہ صرف تمھاری وجہ سے ہم نے اُسے زندہ چھوڑ دیا ہے۔اب بہتر یہی ہے کہ تُم اپنے گھر والے کو لے کر کہیں چلی جاؤ ورنہ ہم اسے زندہ نہ چھوڑیں گے اور تائی ایسری اس واقعہ کے چند روز بعد ہی تایا کو لے کر لاہور آ گئیں۔ محلّہ ونجاراں میں انھوں نے ایک چھوٹا سا مکان لے لیا تھا۔خوش قسمتی سے یا بد قسمتی سے یہاں بھی تایا یودھ راج کا بیوپار چند مہینوں ہی میں چمک اُٹھا۔اسی اثنا میں انھوں نے شاہی محلے کی ایک طوائف پچھی سے دوستی کر لی اور ہوتے ہوتے یہ قصہ یہاں تک بڑھا کہ اب انھوں نے مستقل طور پر اسی پچھی کے گھر رہنا شروع کر دیا تھا اور محلّہ ونجاراں میں قدم تک نہ دھرتے تھے لیکن تائی ایسری کو دیکھ کر کبھی کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ انھیں اس امر کا اِتنا سا بھی ملال ہوا ہوگا۔

یہی وہ زمانہ تھا تایا یودھ راج اور اُسی طوائف کا قصہ زوروں پر تھا۔انھی دنوں ہمارے بڑے بھائی صاحب کی شادی ہوئی۔شادی میں تایا یودھ راج تو شریک نہ ہوئے لیکن تائی نے رشتہ داروں، مہمانوں اور برات کی خدمت گزاری میں دن رات ایک کر دیا۔اُن کی خوش مزاجی سے پیچیدہ سے پیچیدہ گتھیاں سلجھ گئیں۔چہرے پر چڑھی ہوئی تیوریاں اُتر گئیں اور جبینیں شکنوں سے صاف اور منور ہوتی گئیں۔اس میں تائی کی کاوش کا کوئی دخل نہ تھا۔سکون کی شعاعیں گویا خود بخود ان کے جسم سے پھوٹتی تھیں۔انھیں دیکھتے ہی ہر ایک کا غصہ اُتر جاتا تھا۔پیچیدہ سے پیچیدہ اُلجھنیں خود بخود سلجھ جاتیں۔گھر بار میں بشاشت بکھر جاتی۔ایسی تھیں تائی ایسری۔

میں نے تائی ایسری کو کبھی کسی کی بُرائی کرتے نہیں دیکھا۔کبھی قسمت کا گلہ کرتے نہیں دیکھا۔کبھی رنجور یا اُداس نہیں دیکھا۔ہاں ایک بار اُن کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک دیکھی تھی اور وہ واقعہ بھی اسی شادی سے متعلق تھا۔

بڑے بھائی صاحب تو رات بھر شادی کی بیدی پر بیٹھے رہے۔صبح کے پانچ بجے شادی کے بعد لڑکی والوں نے اپنے گھر کے ہال کو جہیز کا سامان دکھانے کے لیے سجا دیا۔پرانے زمانے تھے وہ۔اُس زمانے میں صوفوں کے بجائے رنگین پیڑھیاں دی جاتی تھیں اور منقش پایوں والے پلنگ دیے جاتے تھے۔اُس زمانے میں ڈرائنگ روم کو بیٹھک یا دیوان خانہ کہا جاتا تھا۔میرے بڑے

بھائی کے سُسر ملٹری میں ایگزیکٹیو آفیسر تھے۔ چوں کہ وہ پہلے ہندوستانی ایگزیکٹیو آفیسر تھے اس لیے انھوں نے جہیز میں بہت کچھ دیا تھا اور ساری ہی نئے فیشن کی چیزیں دی تھیں۔ ہماری برادری میں پہلی بار جہیز میں صوفہ سیٹ دیا گیا۔ ساری برادری میں اس صوفہ سیٹ کی دھوم مچ گئی۔ دُور دُور کے محلوں سے بھی عورتیں ''انگریزی پیڑھیوں'' کو دیکھنے کے لیے آنے لگیں۔ تائی ایسری کے لیے بھی صوفہ سیٹ دیکھنے کا پہلا موقع تھا۔ پہلے تو بڑی حیرانی سے اُسے دیکھتی رہیں، اس پر ہاتھ پھیر کر بار بار من ہی من میں کچھ مسکراتی رہیں۔ آخر اُن سے رہا نہ گیا۔

''وے کاکا! اس کو صوفہ سیٹ کیوں بولتے ہیں؟''

اب میں اس کا کیا جواب دیتا، سر ہلا کر کہنے لگا۔ ''مجھے نہیں معلوم تائی!۔''

''اچھا تو اس کی دو کرسیاں چھوٹی کیوں ہیں اور وہ تیسری کرسی لمبی کیوں ہے؟''

میں پھر لاجواب ہو گیا۔ خاموشی سے انکار میں سر ہلا دیا۔

تائی دیر تک سوچتی رہیں۔ پھر یکایک جیسے اُن کی سمجھ میں کچھ آ گیا۔ اُن کا چہرہ اُن کی معصوم سی مسکراہٹ سے روشن ہو اُٹھا۔ بولیں۔ میں بتاؤں؟

میں نے کہا۔ ''بتاؤ تائی!''

وہ ہم سب کو بچوں کی طرح سمجھاتے ہوئے بولیں۔ ''دیکھو میرا خیال ہے کہ یہ لمبا صوفہ تو اس لیے بنا ہے کہ جب دونوں میاں بیوی میں صلح ہو تو وہ دونوں اس لمبے صوفے پر بیٹھیں اور جب ان دونوں میں لڑائی ہو تو الگ الگ ان دو چھوٹے چھوٹے صوفوں پر بیٹھیں۔ سچ مچ یہ انگریز بڑے عقلمند ہوتے ہیں۔ جبھی تو ہم پر حکومت کرتے ہیں۔''

تائی کی دلیل سُن کر محفل میں ایک زوردار قہقہہ پڑا مگر میں نے دیکھا کہ تائی یہ سوچ کر اور بات کہہ کر کچھ چُپ سی رہ گئیں۔ کیا اُس وقت انھیں اپنا اور اپنے خاوند کا جھگڑا یاد آیا تھا؟ یہ تو میں نہیں کہہ سکتا۔

میں نے جب غور سے اُن کی آنکھوں میں دیکھا تو ایک پل کے لیے مجھے اُن کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک نظر آئی۔ پھر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے دریا کا پاٹ بہت چوڑا ہو گیا ہو!

○

کلکتہ سے ایم بی بی ایس کرنے کے بعد میں نے وہیں ایک بنگالی لڑکی سے شادی کر لی اور دھرم تلے میں پریکٹس کرنے لگا۔ کئی سال کوشش کرتا رہا مگر پریکٹس نہ چلی۔ چنانچہ اپنے بڑے

بھائی صاحب کے اصرار پر لاہور چلا آیا۔ بھائی صاحب نے کوچہ ٹھاکر داس کے نکڑ پر مجھے دوکان کھول دی اور میں اپنے گھر میں یعنی اپنے محلے میں، اپنی برادری ہی کے سہارے پریکٹس چلانے لگا۔ کلکتے میں بالکل اناڑی تھا، نوجوان تھا اور زندگی کا تجربہ بھی نہ تھا۔ یہاں آکر جب آٹھ دس برسوں میں گاہک پھانسنے کی ترکیب سمجھ میں آئی تو پریکٹس خود بخود چل نکلی۔ اب دن رات مصروف رہتا تھا۔ بچے بھی ہو گئے تھے، اس لیے زندگی سوت کی انٹی کی طرح ایک ہی مدار پر چکر کھانے لگی۔ اِدھر اُدھر جانے کا موقع کم ملتا تھا۔ اب تو کئی برس سے تائی ایسری کا منہ نہ دیکھا تھا۔ مگر اتنا سُن رکھا تھا کہ تائی ایسری اس مکان میں محلہ ونجاراں میں رہتی ہیں اور تایا یودھ راج شاہی محلے میں اُسی پچھی کے مکان میں رہتے ہیں اور کبھی دوسرے تیسرے ہفتے تائی ایسری کی خبر لینے آجاتے ہیں۔

ایک روز میں صبح کے وقت مریضوں کی بھیڑ میں بیٹھا نسخے تجویز کر رہا تھا کہ محلہ ونجاراں کے ایک آدمی نے آکر کہا:

''جلدی چلیے ڈاکٹر صاحب! تائی ایسری مر رہی ہیں۔''

میں اُسی وقت سب کام چھوڑ چھاڑ کر اُس آدمی کے ساتھ ہولیا۔ محلہ ونجاراں کے بالکل اس آخری سرے پر تائی کا مکان تھا۔ پہلی منزل کی سیڑھیاں چڑھ کر جب میں آہنی سلاخوں والے موکھے سے گزر کر اُن کے نیم تاریک مکان میں داخل ہوا تو وہ بڑے بڑے تکیوں کا سہارا لے کر پلنگ سے لگی بیٹھی تھیں۔ اُن کی سانس زور زور سے چل رہی تھی اور انھوں نے بڑے زور سے اپنے دائیں ہاتھ سے بائیں طرف گویا اپنے دل کو پکڑ رکھا تھا مجھے دیکھ کر ہی وہ پھولی پھولی سانسوں سے مسکرانے لگیں۔ بولیں:

''تو آ گیا پُتر! اب میں بچ جاؤں گی۔''

''کیا تکلیف ہو گئی ہے تائی؟''

''ہوتا کیا؟ موت کا بلاوا آ گیا تھا دو دن مجھے سخت کس (بخار) رہی۔ پھر ایکا ایکی جسم تھوڑا ٹھنڈا ہونے لگا۔''

(بیان کرتے ہوئے تائی کی آنکھوں کی پتلیاں پھسلنے لگیں) پہلے ٹانگوں سے جان گئی۔ ٹانگوں کو ہاتھ لگاؤں تو ٹانگیں ٹھنڈی یخ۔ چٹکی بھروں تو کچھ محسوس نہ ہو۔ پھر دھیرے دھیرے میری جان اُوپر سے بھی نکلنے لگی تو میں نے زور سے اپنے کلیجے کو پکڑ لیا۔'' تائی اپنے دائیں ہاتھ

سے بائیں طرف اپنے دل والے حصے کو اور زور سے پکڑ کر بولیں۔'' تو میں نے زور سے اپنے کلیجے کو پکڑ لیا اور چلائی۔ ارے کوئی ہے۔ کوئی ہے تو جائے اور جے کشن کے بیٹے رادھا کشن کو بلا کر لائے۔ وہی مجھے ٹھیک کر سکتا ہے۔ اب تم آ گئے ہو۔ اب...... اب میں بچ جاؤں گی۔'' تائی ایسری نے طمانیت سے کہا۔

میں نے اپنا ہاتھ تائی کے دائیں ہاتھ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: '' تائی ذرا اپنا یہ ہاتھ اِدھر کرو۔ تمھاری نبض تو دیکھوں!''

ایک دم تائی دوسرے ہاتھ سے میرا ہاتھ جھٹک کر بولیں۔ '' ہائے وے! تُم کیسے ڈاکٹر ہو۔ تجھے اتنا معلوم نہیں کہ اس ہاتھ سے تو میں نے اپنی جان پکڑ رکھی ہے۔ اس ہاتھ کی نبض تجھے کیسے دکھا سکتی ہوں؟''

تائی چند ہفتوں میں اچھی ہو گئیں۔ انھیں تو بلڈ پریشر کی شکایت تھی۔ جب وہ جاتی رہی تو پھر اٹھ کر گھومنے لگیں اور اپنے پرائے سب کے سُکھ دُکھ میں بدستور شریک ہونے لگیں لیکن جب وہ اچھی ہوئیں تو اس کے چند ماہ بعد ہمارے تایا یودھ راج کا انتقال ہو گیا۔ وہیں پھپھی کے گھر شاہی محلے میں۔ اُن کا ہارٹ فیل ہوا۔ وہیں سے اُن کی ارتھی اُٹھی کیونکہ تائی نے اُن کی لاش گھر لانے کی اجازت نہیں دی۔ تائی نہ ارتھی کے ساتھ گئیں نہ انھوں نے شمشان گھاٹ کا رُخ کیا۔ نہ اُن کی آنکھوں سے آنسو کا ایک قطرہ تک نکلا تھا۔ انھوں نے خاموشی سے اپنے سہاگ کی چوڑیاں توڑ ڈالیں۔ رنگین کپڑے اُتار کر سپید دھوتی پہن لی۔ اپنے ماتھے کا سیندور پونچھ کر چولہے کی راکھ اپنے ماتھے پر لگائی۔ مگر اُن کے دھرم کرم میں اور کسی طرح کا فرق نہ آیا بلکہ اپنے سفید بالوں سے وہ اب اس سفید دھوتی میں اور بھی اچھی لگ رہی تھیں۔ تائی کی اس حرکت پر برادری میں چہ میگوئیاں ہوئیں سب کو اچنبھا ہوا مگر تائی کی عزت اس قدر زیادہ تھی کہ اُس کے سامنے زبان کھولنے کی کسی کو ہمت نہ پڑی۔

○

چند برس اور گزر گئے۔ اب میری پریکٹس اس قدر چمک اُٹھی کہ میں نے محلّہ ٹھاکر داس کے علاوہ شاہ عالمی گیٹ، کے اندر کوچہ ٹوکریاں اور وچھووالی کے چوک میں پریکٹس شروع کر دی۔ صبح میں محلّہ ٹھاکر داس میں بیٹھتا تھا، شام کو وچھووالی میں۔ زندگی کچھ اس نہج سے گزر رہی تھی کہ تائی ایسری کو دیکھے ہوئے ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو برس گزر جاتے تھے مگر گھر کی عورتوں سے تائی ایسری کی

خیریت کی خبر ملتی رہتی تھی۔ تایا یودھ راج نے اپنے بینک کا سارا روپیہ تو پچھمی کو سونپ دیا مگر جالندھر کی دوکان اور مکان تائی ایسری کے نام لکھ گئے تھے۔ ان سے ہر ماہ تائی ایسری کو ڈیڑھ سو روپیہ کرایہ آجاتا تھا۔ وہ بدستور اسی طرح محلہ ونجاراں میں رہتی تھیں اور دن رات اپنے دھرم کرم میں ڈوبی رہتی تھیں۔

ایک روز اتفاق سے جب میں شاہی محلہ میں ایک مریض کو دیکھ کر لوٹ رہا تھا تو مجھے تایا یودھ راج کی یاد آ گئی اور اُن کی یاد میں پچھمی کی یاد آ گئی کیونکہ پچھمی بھی اسی شاہی محلے میں کہیں رہتی تھی اور جب پچھمی کی یاد آئی تو میرا ذہن فوراً تائی ایسری کی طرف منتقل ہو گیا اور میرا ضمیر مجھے ملامت کرنے لگا۔ غالباً بارہ پندرہ مہینوں سے میں تائی ایسری کو دیکھنے نہ گیا۔ میں نے سوچا کل یا پرسوں پہلی فرصت میں تائی ایسری کو دیکھنے جاؤں گا۔

ابھی میں یہی سوچ رہا تھا کہ شاہی محلے کی ایک گلی سے میں نے تائی ایسری کو نکلتے دیکھا۔ قرمزی شامی کے بجائے اب وہ سیاہ شامی گھاگھرا پہنے تھیں۔ جس پر نہ گوٹا تھا نہ لچکا۔ قمیص بھی سفید رنگ کی تھی اور سر پر انھوں نے سفید ململ کا دوہرا دوپٹہ لے رکھا تھا۔ جس میں اُن کا گول مٹول چہرہ بالکل میڈونا کی طرح معصوم اور پُراسرار نظر آرہا تھا۔

جس لمحے میں نے انھیں دیکھا اسی لمحے انھوں نے بھی مجھے دیکھا اور مجھے دیکھتے ہی وہ شرما سی گئیں اور فوراً مجھ سے کترا کر واپس گلی میں جانے لگیں کہ میں نے انھیں فوراً آواز دے دی۔ میری آواز میں ایک ایسی حیرت تھی جو ایک چیخ سے مشابہ تھی۔ یہ تائی ایسری یہاں طوائفوں کے محلے میں کیا کر رہی تھیں؟

"تائی ایسری! تائی ایسری!" میں نے چلا کر کہا۔

میری آواز سُن کر وہ پلٹ آئیں۔ سامنے آکر ایک گناہ گار مجرم کی طرح کھڑی ہو گئیں۔ اُن کی نگاہیں اُوپر نہ اُٹھتی تھیں۔

وہ اسی طرح سر نیچا کیے آہستہ آہستہ جھجکتے جھجکتے بولیں۔ "وے پُتر کیا بتاؤں۔ وہ... وہ... میں نے سُنا تھا کہ پچھمی بیمار ہے۔ بہت سخت بیمار ہے۔ میں نے سوچا اُسے دیکھ آؤں...!"

"تُم یہاں پچھمی کو دیکھنے آئی تھیں؟" میں نے غم اور غصے سے تقریباً چیخ کر کہا۔ "پچھمی کو...... اُس بدذات چھنال کو... جس نے... جس نے... تائی ایسری نے آہستہ سے اپنا ہاتھ اُوپر اُٹھایا اور میں کہتے کہتے رُک گیا۔ "ناں کاکا اُس کو کچھ نہ کہو..." تائی ایسری نے اپنی ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں

اُوپر اُٹھائیں اور ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولیں۔ ''مرنے والے کی یہی ایک نشانی رہ گئی تھی۔ آج وہ بھی چل دی۔

○

سن ۱۹۴۷ء کے فسادات میں ہم لوگ لاہور چھوڑ کر جالندھر میں پناہ گزین ہوئے کیونکہ یہاں تائی ایسری کا گھر تھا۔ خاصا کھلا دومنزلہ گھر تھا۔ اُوپر کی منزل انھوں نے اپنے رشتہ داروں، پناہ گزینوں کو دے ڈالی تھی، نچلی منزل میں وہ خود رہتی تھیں۔ ہر روز وہ ریفیوجی کیمپوں میں سیوا کرنے جاتیں اور کبھی کبھار دو ایک یتیم بچے اُٹھا لاتیں۔ چار پانچ ماہ ہی میں انھوں نے چار لڑکے اور تین لڑکیاں اپنے پاس رکھ لیں۔ کیونکہ اُن کے ماں باپ کا کچھ پتہ نہیں چلتا تھا۔ پچھواڑے کے آنگن اور سامنے کے دالان میں بھی انھوں نے مختلف پناہ گزینوں کو سونے اور کھانا پکانے کی اجازت دے دی تھی۔ ہوتے ہوتے اچھا خاصا ایک گھر ایک سرائے میں تبدیل ہو گیا۔ مگر میں نے تائی ایسری کے ماتھے پر کبھی ایک شکن نہیں دیکھی۔ وہ اپنے گھر میں بھی باہر سے اس طرح آتی تھیں جیسے وہ گھر اُن کا نہ ہو۔ اُن پناہ گزینوں کا ہو جنھیں انھوں نے اپنے گھر میں رہنے کی خود اجازت دی تھی۔ عورتوں میں شخصی جائیداد کی حس بہت تیز ہوتی ہے۔ مگر میں نے تو عورتوں میں تو کیا مردوں میں بھی ایسا کوئی فرد مشکل ہی سے دیکھا ہوگا جسے تائی ایسری کی طرح شخصی جائیداد کا اس قدر کم احساس ہو۔ قدرت نے اُن کے دماغ میں شاید یہ خانہ ہی خالی رکھا تھا۔ اُن کے پاس جو کچھ تھا دوسروں کے لیے وقف تھا جالندھر آ کر وہ صرف ایک وقت کھانا کھانے لگی تھیں۔ میں اُن کی حرکتوں سے بہت چڑتا تھا کیونکہ میں نے اپنی قیمتی پریکٹس لاہور میں کھو دی تھی۔ میری ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی بھی وہیں رہ گئی تھی اور اب میرے پاس سر چھپانے کو کہیں جگہ نہ تھی۔ میرے پاس نہ ڈھنگ کے کپڑے تھے، نہ روپیہ پیسہ تھا، نہ کھانا پینا ٹنگ کا ہو سکتا تھا، جو ملا کھا لیا، جب ملا کھا لیا۔ نہ ملا تو بھوکے رہ گئے۔ ان ہی دنوں مجھے خونی بواسیر لاحق ہو گئی۔ دوائیں تو میں نے طرح طرح کی استعمال کیں کیونکہ میں خود ڈاکٹر تھا مگر اس بے سروسامانی میں علاج کے ساتھ پرہیز ضروری ہے وہ کہاں سے ہوتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں دن بدن کمزور ہوتا چلا گیا۔ کچھ روز تک تو میں نے تائی سے اپنی حالت کو چھپائے رکھا مگر ایک روز انھیں پتہ چل ہی گیا۔ فوراً گھبرائی گھبرائی میرے پاس پہنچیں اور مجھ سے کہنے لگیں:

''کاکا! میں تم سے کہتی ہوں یہ خونی بواسیر ہے۔ یہ ڈاکٹری علاج سے ٹھیک نہ ہو گی۔ تم ایسا

کرو، کرایہ مجھ سے لو اور سیدھے گوجرانوالہ چلے جاؤ۔ وہاں محلہ سنیاراں میں چاچا کریم بخش جراح رہتا ہے۔ اُس کے پاس ایک ایسی دوائی ہے جس سے خونی بواسیر ٹھیک ہو جاتی ہے۔ تیرے تایا کو بھی آج سے بیس سال پہلے تکلیف ہو گئی تھی اور اُسے چاچا کریم بخش ہی نے ٹھیک کر دیا تھا۔ دس دن میں ٹھیک ہو کر گوجرانوالہ سے واپس جالندھر آ گئے تھے۔"

یہ سُن کر مجھے بے حد غصہ آیا۔ میں نے کہا۔" تائی تجھے معلوم ہے۔ اب میں گوجرانوالہ نہیں جا سکتا۔"

" کیوں نہیں جا سکتا؟ ٹکٹ کے پیسے میں دیتی ہوں۔"

" ٹکٹ کا سوال نہیں ہے۔ گوجرانوالہ اب پاکستان میں ہے۔"

" پاکستان میں ہے تو کیا ہوا۔ کیا ہم دوا دارو کے لیے بھی وہاں نہیں جا سکتے۔ وہاں اپنا چاچا کریم بخش............"

میں نے تائی کی بات کاٹ کر کہا۔" تائی تجھے کچھ معلوم تو ہے نہیں۔ خواہ مخواہ اُلٹی سیدھی باتیں کرتی ہو۔ مسلمانوں نے اب اپنا دیس الگ کر لیا ہے۔ اُس کا نام پاکستان ہے۔ اب نہ ہندوستان والے پاکستان جا سکتے ہیں نہ پاکستان والے یہاں آ سکتے ہیں۔ اس کے لیے پاسپورٹ کی ضرورت ہوگی۔"

تائی کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔ بولیں۔" پاس کورٹ؟ کیا اس کے لیے کچہری جانا پڑتا ہے؟"

میں نے جلدی سے ٹالنے کے لیے ہاں کہہ دیا۔ اب اس بڑھیا کو کون سمجھائے۔

" نہ بیٹا کورٹ جانا اچھا نہیں ہوتا۔ شریفوں کے بیٹے کبھی کچہری نہیں جاتے مگر وہ چاچا کریم بخش......؟"

" بھاڑ میں جائے چاچا کریم بخش۔" میں نے چلا کر کہا۔" بیس سال پہلے کی بات کرتی ہو۔ جانے وہ تمھارا چاچا کریم بخش آج زندہ بھی ہے کہ مر گیا مگر تم وہی اپنا چاچا کریم بخش رٹے جا رہی ہو۔" تائی روتی ہوئی وہاں سے چلی گئیں، اُن کے جانے کے بعد مجھے اپنی تنک مزاجی پر بے حد افسوس ہوا۔ کیوں میں نے اس معصوم عورت کا دل دکھایا؟ اگر تائی آج کی زندگی کی بہت سی دشواریوں کو نہیں سمجھ سکتی تو اس میں ان کا کیا قصور؟

دراصل میں ان دنوں بہت ہی تلخ مزاج ہو چلا تھا۔ کالج کے دنوں میں اکثر انقلاب کی

باتیں کیا کرتا تھا، پھر جب زندگی نے مجھے کامرانی بخشی تو انقلاب کا جوش سرد پڑ گیا اور ہوتے ہوتے یہ لفظ میرے ذہن سے محو ہو گیا۔ اب جالندھر آ کر جو یہ افتاد پڑی تو میرے دل میں پھر سے انقلاب کے خیال نے کروٹ لی اور میں اپنی طرح کے چند جوشیلے اور لیٹے پٹے لوگوں کی صحبت میں بیٹھ کر پھر سے اسی تلخی، تیزی اور تندی سے انقلاب کی باتیں کرنے لگا۔ یہ سب لوگ اکثر تائی ایسری کی دوسری منزل میں میرے کمرے میں ملتے۔ چائے کا دور چلتا اور دنیا جہان کی باتیں ہوتیں اور میں جوش سے اپنا مُکا ہوا میں لہرا کر کہتا۔ ''ہم سے انصاف نہیں ہو رہا ہے اور ان لوگوں سے انصاف کی توقع بھی نہیں ہے۔ یقیناً اس ملک میں پھر ایک انقلاب آئے گا اور ضرور آ کے رہے گا وہ انقلاب......!''

ایک دن تائی ایسری نے ہماری باتیں سن لیں تو گھبرائی اندر آئیں، بولیں:

''بیٹا کیا مسلمان پھر یہاں آئیں گے؟''

''نہیں تائی۔ تُم سے کس نے کہا؟''

''تو تم یہاں کس 'انقلاب' کی بات کر رہے ہو؟ جو یہاں آئے گا۔''

تائی نے انقلاب کو مسلمان سمجھا تھا جب بات ہماری سمجھ میں آئی تو ہم سب ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے۔

''کتنی بھولی ہے ہماری تائی۔ ارے تائی ہم تو اس انقلاب کا ذکر کر رہے ہیں جو نہ ہندو ہے نہ مسلمان ہے۔ جو سب کا انقلاب ہے۔ ہم تو اُس انقلاب کو لانا چاہتے ہیں۔''

مگر تائی کی سمجھ میں نہ آیا۔ وہ ہولے سے سر ہلا کر بولیں۔ ''اچھا تم لوگ باتیں کرو میں تمھارے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔''

O

تائی نے میری مدد کرنے کے لیے اپنا سولہ تولے کا گوکھرو بیچ دیا۔ اس رقم کو لے کر میں اپنی فیملی کے ساتھ دہلی آ گیا کیونکہ جالندھر میں بے حد افراتفری تھی اور غیر یقینی سی حالت ہر وقت چھائی رہتی تھی۔ دہلی آ کر میں نے پھر سے پریکٹس شروع کر دی۔ چند سالوں ہی میں میری پریکٹس پھر چمک اُٹھی۔ میں نے قرول باغ میں اپنی کوٹھی کھڑی کر لی۔ گاڑی بھی خرید لی۔ اب قرول باغ کے سرکردہ افراد میں میرا شمار ہوتا ہے۔ اب میں پھر انقلاب کی باتیں بھول گیا۔ میری خونی بواسیر بھی ٹھیک ہو گئی اور تلخی کے بجائے میرے مزاج میں شگفتگی عود کر آئی جو ایک ڈاکٹر کے مزاج کے

لیے بے حد ضروری ہے۔

تیرہ سال کے بعد گزشتہ مارچ میں مجھے ایک عزیز کی شادی میں جالندھر جانا پڑا۔ اس تیرہ سال کے عرصہ میں تائی ایسری کو بالکل بھول گیا تھا۔ رشتہ دار تو اُس وقت یاد آتے ہیں جب مریض نہ ہوں لیکن جالندھر پہنچتے ہی مجھے تائی ایسری یاد آئی۔ اُن کے احسانات یاد آئے، وہ سونے کا گوکھرو یاد آیا جسے بیچ کر میری پریکٹس چلانے کی رقم بہم پہنچائی گئی تھی اور وہ رقم میں نے آج تک تائی ایسری کو ادا نہیں کی تھی۔ جالندھر اسٹیشن پر اُترتے ہی سیدھا تائی ایسری کے گھر چلا گیا۔

شام کا جھٹپٹا تھا۔ ہوا ایندھن کے دھوئیں، تیل کی بدبو اور گھر واپس آتے ہوئے بچوں کی آوازوں سے معمور تھی، جب میں تائی ایسری کے مکان کی دوسری منزل میں داخل ہوا گھر میں اُس وقت تائی کے سوا کوئی نہیں تھا۔ وہ اپنے کمرے میں بھگوان کی مورتی کے سامنے گھی کا دیا جلائے، پھول چڑھا کر ہاتھ جوڑ کر واپس گھوم رہی تھی جب کہ انھوں نے میری آہٹ پا کر پوچھا۔ ''کون ہے؟''

''میں ہوں!'' میں نے کمرے میں دو قدم آگے بڑھا کر مسکراتے ہوئے کہا۔

تائی دو قدم آگے بڑھیں مگر مجھے پہچان نہ سکیں۔ تیرہ برس کا عرصہ بھی ایک عرصہ ہوتا ہے۔ اس عرصے میں وہ بے حد نحیف و نزار ہو گئی تھیں، اُن کا چہرہ بھی دُبلا پتلا ہو گیا تھا اور وہ ہولے ہولے قدم اُٹھاتی تھیں۔

''میں رادھا کشن ہوں۔''

''بے کشن دا کاکا؟'' تائی کی آواز بھرا گئی۔ ممکن تھا وہ جلدی سے آگے بڑھنے کی کوشش میں گر پڑتیں مگر میں نے جلدی سے تھام لیا اور وہ میرے بازو سے لگ کر رونے لگیں۔ انھوں نے میری بلائیں لیں۔ میرا منہ چوما۔ میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولیں۔ ''اتنے دن کہاں رہے بیٹا؟''

انتہائی شرمندگی سے میرا سر جھک گیا۔ میں نے کچھ کہنا چاہا مگر کچھ نہ کہہ سکا۔ تائی نے میری پریشانی کو فوراً بھانپ لیا۔ جلدی سے پھولی پھولی سانسوں میں اُکھڑے اُکھڑے لہجے میں بولیں:

''سروج راضی خوشی ہے نا؟''

''ہاں تائی۔''

''اور وڈا کاکا؟''

''ڈاکٹری میں پڑھتا ہے۔''

''اور نِکا؟''

''کالج میں پڑھتا ہے۔''

''اور شانو اور بٹو؟''

''وہ دونوں بھی کالج میں پڑھتی ہیں اور کملا کی شادی کر دی ہے۔''

''میں نے بھی سوتری کی شادی کر دی ہے۔ پورن اب رُڑکی میں پڑھتا ہے۔ نمی اور بنی کے ماں باپ مل گئے تھے۔ وہ آ کر اُن کو چھ سال کے بعد لے گئے تھے۔ کبھی کبھی اُن کی چٹھی پتری آ جاتی ہے۔ میرے پاس اب صرف گوپی رہ گیا ہے۔ اگلے سال وہ بھی ریلوے ورک شاپ میں کام سیکھنے کے لیے چلا جائے گا۔''

یہ تائی کی اُن یتیم بچوں کی داستان تھی جو انھوں نے فساد میں لے کر پالے تھے۔

میں نے ناخن سے اپنی ٹھوڑی کھجاتے کھجاتے کہا۔'' تائی وہ تیرا قرضہ مجھ پر باقی ہے۔ کیسے بتاؤں، کتنا شرمندہ ہوں۔ اب تک نہ بھیج سکا۔ اب دلی جاتے ہی بھیج دوں گا۔''

''کیسا قرضہ بیٹا؟'' تائی نے حیران ہو کر پوچھا۔

''وہی گوکھر و والا۔''

''اچھا وہ؟'' یکا یک تائی کو یاد آیا اور وہ بڑے میٹھے انداز میں مسکرانے لگیں۔ پھر میرے سر پر ہاتھ پھیر کر بولیں۔'' وہ تیرا قرضہ تھا بیٹا جو میں نے چکا دیا۔''

''میرا قرض کیسا تھا تائی؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''یہ زندگی دوسروں کا قرضہ ہے بیٹا!'' تائی سنجیدہ رو ہو کر بولیں۔'' اسے چکاتے رہنا چاہیے۔ تُو کیا اس سنسار میں خود پیدا ہوا تھا؟ نہیں۔ تجھے تیرے ماں باپ نے زندگی دی تھی۔ تو پھر تیری زندگی کسی دوسرے کا قرضہ ہوئی کہ نہیں؟ پھر یہ قرضہ ہم نہیں چکائیں گے تو یہ دنیا آگے کیسے چلے گی؟ ایک دن 'پرلے' آ جائے گی...... بیٹا اسی لیے تو کہتی ہوں، میں نے تیرا قرضہ چکایا ہے، تو کسی دوسرے کا چکا دے...... ہر دم چکاتے رہنا، جیون کا دھرم ہے'' تائی اتنی لمبی بات کر کے ہانپنے لگیں۔

میں کیا کہتا۔ روشنی سے سایہ کہہ بھی کیا سکتا ہے؟ اسی لیے میں سب کچھ سُن کر چپ ہو گیا۔ وہ بھی چُپ ہو گئیں۔ پھر آہستہ سے بولیں اب میرے ہاتھ پاؤں کام نہیں کرتے۔ ورنہ تیرے لیے

کھانا پکاتی۔ اب گوپی آئے گا تو کھانا بنائے گا تیرے لیے۔ کھانا کھا کر جانا...... میں......"

"نہیں تائی اس کی کیا ضرورت ہے؟ وہاں بھی تیرا ہی دیا کھاتے ہیں۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "میں یہاں تیج پال کی شادی میں آیا تھا۔ اسٹیشن سے سیدھا تمھارے گھر آ رہا ہوں۔ اب شادی والے گھر جاؤں گا۔"

"بلاوا تو مجھے بھی آیا ہے مگر دو دن سے میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اس لیے میں نہیں جا سکتی۔ شگن میں نے بھیج دیا تھا۔ تم میری طرف سے تیج پال کے سر پر پیار دینا۔"

"بہت اچھا تائی!" یہ کہہ کر میں تائی کے چرنوں میں جھکا۔ انھوں نے مجھے بڑے پیار سے اپنے گلے لگا لیا۔ میرے سر پر ہاتھ پھیر کر سو سو دعائیں دے کر بولیں۔ "لو بیٹا میرا ایک کام کرو گے؟"

"حکم کرو تائی۔"

"کیا کل تم صبح یہاں آ سکتے ہو؟"

"کیا بات ہے تائی؟ اب میں تمھیں مل کے تو جا رہا ہوں۔"

تائی جھجکتے جھجکتے بولیں۔ "میری آنکھیں کمزور ہو چکی ہیں رات میں مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔ اگر تم صبح کسی وقت دن میں آ جاؤ تو میں تمھیں اچھی طرح دیکھ لوں گی۔ تیرہ سال سے تجھے نہیں دیکھا ہے کاکا!"

"آ جاؤں گا تائی۔!"

○

دوسرے دن بارات کے کچھ لوگ آنے والے تھے۔ صبح ہی ہم لوگوں کو پیشوائی کے لیے اسٹیشن جانا پڑا۔ وہاں سے لوٹتے وقت مجھے یاد آیا تو میں اُن لوگوں سے معذرت کر کے تائی ایسری کے گھر کی طرف ہو لیا۔ گلی کے موڑ پر لوگ دو دو چار چار کی ٹولیوں میں سر جھکائے ملے۔ مگر میں جلدی جلدی سے قدم بڑھاتا ہوا آگے چلا گیا۔ مکان کی نچلی منزل پر مجھے اور بہت سے لوگ روتے ہوئے ملے۔ معلوم ہوا آج صبح تائی ایسری کی موت واقع ہو گئی اور جب ہم اسٹیشن گئے ہوئے تھے تو وہ چل بسیں۔

اندر کمرے میں اُن کی لاش پڑی تھی۔ ایک سفید چادر میں ملبوس، چہرہ کھلا رہنے دیا تھا۔ کمرے میں کافور اور لوبان کی خوشبو تھی اور ایک پنڈت ہولے ہولے وید منتر پڑھ رہا تھا۔

تائی ایسری کی آنکھیں بند تھیں اور اُن کا معصوم بھورا بھورا چہرہ پُر سکون، خاموش اور گہرے خوابوں میں کھویا ہوا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ تائی ایسری کا چہرہ نہ ہو۔ دھرتی کا پھیلا ہوا لامتناہی چہرہ ہو۔ جس کی آنکھوں سے ندیاں بہتی ہیں۔ جس کی ہر شکن میں لاکھوں وادیاں انسانی بستیوں کو اپنی آغوش میں لیے مسکراتی ہیں۔ جس کے انگ انگ سے بے غرض پیار کی مہک پھوٹتی ہے۔ جس کی معصومیت میں تخلیق کی پاکیزگی جھلکتی ہے۔ جس کے دل میں دوسروں کے لیے وہ بے پناہ ممتا جاگتی ہے جس کا مزہ کوئی کوکھ رکھنے والی ہستی ہی پہچان سکتی ہے۔ میں اُن کے پاؤں کے قریب کھڑا اُن کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یکا یک کسی نے آہستہ سے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو میرے سامنے بائیس تیئیس برس کا ایک نوجوان کھڑا تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ ابھی روئی ہیں اور ابھی رو دیں گی۔

اُس نے آہستہ سے کہا۔ ''میں گوپی ناتھ ہوں۔''

میں سمجھ تو گیا مگر خاموش رہا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کیا کہوں کیا نہ کہوں؟

''میں تیج پال کے گھر آپ کو ڈھونڈنے گیا تھا مگر آپ اسٹیشن پر گئے ہوئے تھے۔'' وہ پھر بولا۔ میں پھر بھی چپ رہا۔ گوپی ناتھ دھیرے سے بولا ''صبح تائی نے آپ کو بہت یاد کیا۔ انھیں معلوم تھا کہ آپ آنے والے ہیں۔ اس لیے وہ مرتے مرتے بھی آپ کا انتظار کرتی رہیں۔ آخر جب انھیں یقین ہو گیا کہ مرنے کا وقت آن پہنچا ہے تو انھوں نے مجھ سے کہا:

''جب میرا بیٹا رادھا کشن آئے تو اُسے یہ دے دینا؟''

یہ کہہ کر گوپی نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور میری ہتھیلی پر ایک چونی رکھ دی۔

چونی دیکھ کر میں رونے لگا۔

مجھے معلوم نہیں ہے۔ آج تائی ایسری کہاں ہیں لیکن اگر وہ سورگ میں ہیں تو اس وقت بھی یقیناً ایک رنگین پیڑھی پر بیٹھی اپنی پکھی سامنے کھول کر بڑے اطمینان سے دیوتاؤں کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے انھیں چونیاں ہی بانٹ رہی ہوں گی۔

(اُردو بک ڈائجسٹ، لاہور کرشن چندر نمبر شمارہ ۶)

◆◆◆

دو فرلانگ لمبی سڑک

کچہریوں سے لے کر کالج تک بس یہی کوئی دو فرلانگ لمبی سڑک ہوگی۔ ہر روز مجھے اسی سڑک پر سے گزرنا ہوتا ہے۔ کبھی پیدل، کبھی سائیکل پر۔ سڑک کے دورویہ شیشم کے سوکھے اُداس سے درخت کھڑے ہیں۔ ان میں نہ حسن ہے نہ چھاؤں۔ سخت کھردرے سے تنے اور ٹہنیوں پر گدھوں کے جھنڈ۔ سڑک صاف سیدھی اور سخت ہے۔ متواتر نو سال سے میں اس پر چل رہا ہوں۔ نہ اس میں کبھی کوئی گڑھا دیکھا ہے نہ شگاف۔ سخت سخت پتھروں کو کوٹ کوٹ کر یہ سڑک تیار کی گئی ہے اور اب اس پر کول تار بھی بچھی ہے، جس کی عجیب سی بو گرمیوں میں طبیعت کو پریشان کر دیتی ہے۔

سڑکیں تو میں نے بہت دیکھی ہیں۔ لمبی لمبی چوڑی سڑکیں، برادے سے ڈھکی سڑکیں جن پر سرخ بجری بچھی ہوئی تھی، سڑکیں جن کے گرد سرو، شمشاد کے درخت کھڑے تھے۔ سڑکیں...... مگر نام گنانے سے کیا فائدہ؟ اس طرح تو ان گنت سڑکیں دیکھی ہوں گی لیکن جتنی اچھی طرح میں اس سڑک کو جانتا ہوں، کسی اپنے گہرے دوست کو بھی اتنی اچھی طرح نہیں جانتا۔ متواتر نو سال سے اسے جانتا ہوں اور ہر صبح اپنے گھر سے جو کچہریوں کے قریب ہی ہے، اُٹھ کر دفتر جاتا ہوں جو لاء کالج کے پاس ہی ہے، بس یہی دو فرلانگ کی سڑک۔ ہر صبح اور ہر شام کچہریوں سے لے کر لاء کالج کے آخری دروازے تک، کبھی سائیکل پر کبھی پیدل۔

اس کا رنگ کبھی نہیں بدلتا۔ اس کی ہیئت میں تبدیلی نہیں آتی۔ اس کی صورت میں روکھا پن بدستور موجود ہے۔ جیسے کہہ رہی ہو مجھے کسی کی پروا نہیں ہے اور یہ ہے بھی سچ، اسے کسی کی پروا کیوں ہو؟ سیکڑوں، ہزاروں انسان، گھوڑے گاڑیاں، موٹریں اس پر سے ہر روز گزر جاتی ہیں اور

پیچھے کوئی نشان باقی نہیں رہتا۔ اس کی ہلکی نیلی اور سانولی سطح اس طرح سخت اور سنگلاخ ہے جیسے پہلے روز تھی۔ جب ایک یوریشین ٹھیکیدار نے اسے بنایا تھا۔

یہ کیا سوچتی ہے؟ شاید یہ سوچتی ہی نہیں۔ میرے سامنے ہی ان نو سالوں میں اس نے کیا کیا واقعات، حادثے دیکھے۔ ہر روز، ہر لحہ کیا نئے تماشے نہیں دیکھتی؟ لیکن کسی نے اسے مسکراتے نہیں دیکھا، نہ روتے ہی۔ اس کی پتھریلی چھاتی میں کبھی ایک درز بھی پیدا نہیں ہوتی۔

''ہائے بابو اندھے محتاج، غریب، فقیر پر ترس کھا کر جاؤ رے بابا۔ اے بابو! خدا کے لیے ایک پیسہ دیتے جاؤ رے بابا۔ ارے کوئی بھگوان کا پیارا نہیں، صاحب جی میرے ننھے ننھے بچے بلک رہے ہیں۔ ارے کوئی تو ترس کھاؤ ان یتیموں پر۔''

بیسیوں گداگر اسی سڑک کے کنارے بیٹھے رہتے ہیں۔ کوئی اندھا ہے تو کوئی لنجا۔ کسی کی ٹانگ پر ایک زخم ہے تو کوئی غریب عورت دو تین چھوٹے بچے گود میں لیے حسرت بھری نگاہوں سے راہگیروں کی طرف دیکھتی ہے...... کوئی پیسہ دے دیتا ہے، کوئی تیوری چڑھائے گزر جاتا ہے، کوئی گالی دے رہا ہے، حرامزادے، مستنڈے کام نہیں کرتے، بھیک مانگتے ہیں۔

کام، بیکاری، بھیک۔

دو لڑکے سائیکل پر سوار ہنستے ہوئے جا رہے ہیں۔ ایک بوڑھا امیر آدمی اپنی شاندار فٹن میں بیٹھا سڑک پر بیٹھی ہوئی بھکارن کی طرف دیکھ رہا ہے اور اپنی انگلیوں سے مونچھوں کو تاؤ دے رہا ہے۔ ایک ست مضمحل کتا فٹن کے پہیوں تلے آ گیا ہے۔ اُس کی پسلی کی ہڈیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ لہو بہہ رہا ہے۔ اُس کی آنکھوں کی افسردگی، بے چارگی، اُس کی ہلکی ہلکی دردناک ٹیاؤں ٹیاؤں کسی کو اپنی طرف متوجہ نہیں کرسکتی۔ بوڑھا آدمی اب گدیلوں پر جھکا اُس عورت کی طرف دیکھ رہا ہے جو ایک خوشنما سیاہ رنگ کی ساڑی زیب تن کیے اپنے نوکر کے ساتھ مسکراتی ہوئی باتیں کرتی جا رہی ہے۔ اس کی سیاہ ساڑی کا نقرئی حاشیہ بوڑھے کی حریص آنکھوں میں چاند کی کرن کی طرح چمک رہا ہے۔

پھر کبھی سڑک سنسان ہوتی ہے۔ صرف ایک جگہ شیشم کے درخت کی جگہ چھدری چھاؤں میں ایک تانگے والا گھوڑے کو ستا رہا ہے۔ گدھ دھوپ میں ٹہنیوں پر بیٹھے اونگھ رہے ہیں۔ پولیس کا سپاہی آتا ہے، ایک زور کی سیٹی، او تانگے والے یہاں کھڑا کیا کر رہا ہے؟ کیا نام ہے تیرا کردوں چالان؟۔ حجور، حجور کا بچہ! چل تھانے، حجور یہ تھوڑا سا۔ اچھا جا تجھے معاف کیا۔

تانگے والا تانگے کو سرپٹ دوڑائے جا رہا ہے۔ راستے میں ایک ''گورا'' آ رہا ہے۔ سر پر ٹیڑھی ٹوپی، ہاتھ میں بید کی چھڑی، رخساروں پر پسینہ، لبوں پر کسی ڈانس کا سُر۔

کھڑا کرو وکنٹونمنٹ۔

آٹھ آنے صاب۔

ول چھ آنے۔

نہیں صاب۔

کیا بکتا ہے۔ تُم......

تانگے والے کو مارتے مارتے بید کی چھڑی ٹوٹ جاتی ہے۔ پھر تانگے والے کا چمڑے کا ہنٹر کام آتا ہے۔ لوگ اکٹھے ہو رہے ہیں۔ پولیس کا سپاہی بھی پہنچ گیا ہے۔ حرامزادے، صاحب بہادر سے معافی مانگو، تانگے والا اپنی میلی پگڑی کے گوشے سے آنسو پونچھ رہا ہے، لوگ منتشر ہو جاتے ہیں۔

اب سڑک پھر سنسان ہے۔

شام کے دھندلکے میں بجلی کے قمقمے روشن ہو گئے۔ میں نے دیکھا کہ کچہریوں کے قریب چند مزدور بال بکھرے، میلے لباس پہنے باتیں کر رہے ہیں۔ بھیا بھرتی ہو گیا۔

ہاں تنخواہ تو اچھی ملتی ہو گی؟ ہاں بڑھو کے لیے کما لائے گا۔ پہلے بیوی تو ایک ہی پھٹی ساڑی میں رہتی تھی۔ سنا ہے، جنگ شروع ہونے والی ہے۔ کب شروع ہو گی؟ کب اس کا تو پتہ نہیں مگر ہم گریب ہی تو مارے جائیں گے۔ کون جانے گریب مارے جائیں گے کہ امیر۔ ننھا کیسا ہے؟ بخار نہیں ٹلتا۔ کیا کریں؟ اِدھر جیب میں پیسے نہیں ہیں۔ اُدھر حکیم سے دوا......

بھرتی ہو جاؤ سوچ رہے ہیں

رام رام

رام رام

پھٹی ہوئی دھوتیاں ننگے پاؤں، تھکے ہوئے قدم۔ یہ کیسے لوگ ہیں۔ یہ نہ تو آزادی چاہتے ہیں نہ حریت۔ یہ کیسی عجیب باتیں ہیں۔ پیٹ، بھوک، بیماری، پیسے، حکیم کی دوا، جنگ......

قمقموں کی زرد زرد روشنی سڑک پر پڑ رہی ہے۔ دو عورتیں ایک بوڑھی ایک جوان، اُپلوں کے ٹوکرے اُٹھائے خچروں کی طرح ہانپتی ہوئی گزر رہی ہیں۔ جوان عورت کی چال تیز ہے۔

''بیٹی ذرا ٹھہر تو۔'' بوڑھی عورت کے چہرے پر بے شمار جھریاں ہیں۔ اُس کی چال مدھم ہے۔ اُس کے لہجے میں بے کسی ہے۔

بیٹی، میں ذرا ٹھہر، میں تھک گئی...... میرے اللہ!

اماں! ابھی گھر جا کر روٹی پکانی ہے۔ تُو تو باؤلی ہوئی ہے۔

اچھا بیٹی! اچھا بیٹی۔ بوڑھی عورت جوان عورت کے پیچھے بھاگتی ہوئی جارہی ہے۔ بوجھ کے مارے اس کی ٹانگیں کانپ رہی ہیں۔ اُس کے پاؤں ڈگمگا رہے ہیں۔ وہ صدیوں سے اسی سڑک پر چل رہی ہے۔ اُپلوں کا بوجھ اُٹھائے ہوئے۔ کوئی اس کا بوجھ ہلکا نہیں کرتا، کوئی اسے ایک لمحہ ستانے نہیں دیتا۔ وہ بھاگی ہوئی جارہی ہے۔ اُس کی ٹانگیں کانپ رہی ہیں۔ اُس کے پاؤں ڈگمگا رہے ہیں اُس کی جھریوں میں غم ہے اور بھوک اور فکر اور غلامی اور صدیوں کی غلامی۔ تین چار نوخیز لڑکیاں۔ بھڑکیلی ساڑیاں پہنے۔ باہوں میں باہیں ڈالے جارہی ہیں۔ بہن آج شملہ پہاڑی کی سیر کریں؟ بہن آج لارنس گارڈن چلیں۔ بہن آج انار کلی ریگل شٹ اپ یو فول۔

☆

آج سڑک پر سرخ حلوان بچھا ہے۔ آر پار جھنڈیاں لگی ہوئی ہیں۔ جا بجا پولیس کے سپاہی کھڑے ہیں کسی بڑے آدمی کی آمد ہے جبھی تو اسکولوں کے چھوٹے چھوٹے لڑکے نیلی پگڑیاں باندھے سڑک پر دورویہ قطاروں میں کھڑے ہیں۔ اُن کے ہاتھوں میں چھوٹی چھوٹی جھنڈیاں ہیں۔ ان کے لبوں پر پیپڑیاں جم گئی ہیں۔ ان کے چہرے دھوپ کی حدت سے تمتما اُٹھے ہیں۔ اسی طرح کھڑے کھڑے وہ ڈیڑھ گھنٹہ سے بڑے آدمی کا انتظار کر رہے ہیں۔ جب وہ پہلے پہلے سڑک پر کھڑے ہوئے تھے تو ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ اب سب چُپ ہیں۔ چند لڑکے ایک درخت کی چھاؤں میں بیٹھ گئے تھے۔ اب اُستاد انھیں کان سے پکڑ کر اُٹھا رہے ہیں۔ شفیع کی پگڑی کھُل گئی تھی۔ اُستاد اُسے گھور کر کہہ رہا ہے۔ او شفی، پگڑی ٹھیک کر۔ پیارے لال کی شلوار اُس کے پاؤں میں اٹک گئی ہے اور ازار بند جوتیوں تک لٹک رہا ہے۔

''تمھیں کتنی بار سمجھایا ہے پیارے لال!''

''ماسٹر جی! پانی''

پانی کہاں سے لاؤں۔ یہ بھی تم نے اپنا گھر سمجھ رکھا ہے۔ دو تین منٹ اور انتظار کرو۔ بس ابھی چھٹی ہوئی جاتی ہے۔

دو منٹ، تین منٹ، آدھ گھنٹہ۔ ماسٹر جی! پانی۔ ماسٹر جی بڑی پیاس لگی ہے لیکن اُستاد اب اس طرف متوجہ نہیں ہوتے اور اِدھر اُدھر دوڑتے پھر رہے ہیں۔ لڑکو ہوشیار ہو جاؤ دیکھو جھنڈیاں اس طرح ہلانا۔ ابے تیری جھنڈی کہاں ہے؟ قطار سے باہر ہو جا۔ بدمعاش کہیں کا...... سواری آرہی ہے۔

موٹر سائیکلوں کی پھٹ پھٹ، بینڈ کا شور، پتلی اور چھوٹی جھنڈیاں بے دلی سے ہلتی ہوئی۔ سوکھے ہوئے گلوں سے پژمردہ نعرے۔

بڑا آدمی سڑک سے گزر گیا۔ لڑکوں کی جان میں جان آگئی۔ اب وہ اُچھل اُچھل کر جھنڈیاں توڑ رہے ہیں۔ شور مچا رہے ہیں۔

خوانچے والوں کی صدائیں۔ ریوڑیاں۔ گرم گرم چنے۔ حلوہ پوری۔ نان کباب۔

ایک خوانچے والا ایک طرّے والے بابو سے جھگڑ رہا ہے...... مگر آپ نے میرا خوانچہ اُلٹ دیا۔ میں آپ کو نہیں جانے دوں گا۔ میرا تین روپے کا نقصان ہو گیا۔ میں غریب آدمی ہوں میرا نقصان پورا کر دیجیے تو میں جانے دوں گا۔

...صبح ہلکی ہلکی روشنی میں بھنگی سڑک پر جھاڑو دے رہا ہے۔ اُس کے منہ اور ناک پر کپڑا بندھا ہے۔ جیسے بیلوں کے منہ پر جب وہ کولہو چلاتے ہیں۔ وہ گرد و غبار میں اٹا ہوا ہے اور جھاڑو دیے جا رہا ہے۔

میونسپلٹی کا پانی والا چھکڑا آہستہ آہستہ سڑک پر چھڑکاؤ کر رہا ہے۔ چھکڑے کے آگے جُتے دو بیلوں کی گردنوں پر زخم پیدا ہو گئے ہیں۔ چھکڑے والا سردی سے ٹھٹھرتا ہوا کوئی گیت گانے کی کوشش کر رہا ہے۔ بیلوں کی آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ ابھی سڑک کا کتنا حصہ باقی ہے۔

سڑک کے کنارے ایک بوڑھا گداگر مرا پڑا ہے۔ اُس کے میلے دانت ہونٹوں کے اندر دھنس گئے ہیں۔ اُس کی کھلی ہوئی بے نور آنکھیں آسمان کی طرف تک رہی ہیں۔ خدا کے لیے مجھ غریب پر ترس کر جاؤ رے بابا! کوئی کسی پر ترس نہیں کرتا۔ سڑک خاموش اور سنسان ہے۔ یہ سب کچھ دیکھتی ہے سنتی ہے مگر ٹس سے مس نہیں ہوتی، انسان کے دل کی طرح بے رحم، بے حس اور وحشی ہے۔ انتہائی غیظ و غضب کی حالت میں اکثر سوچتا ہوں کہ اگر اسے ڈائنامیٹ لگا کر اُڑا دیا جائے تو پھر کیا ہو۔ ایک بلند دھماکے کے ساتھ اس کے ٹکڑے فضا میں پرواز کرتے نظر آئیں گے۔ اُس وقت مجھے کتنی مسرت حاصل ہوگی۔ اس کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔ کبھی کبھی اس کی سطح پر چلتے چلتے

میں پاگل سا ہو جاتا ہوں۔ چاہتا ہوں کہ اسی دم کپڑے پھاڑ کر ننگا سڑک پر ناچنے لگوں اور چلا چلا کر کہوں۔ میں انسان نہیں ہوں۔ میں پاگل ہوں۔ مجھے انسانوں سے نفرت ہے۔ مجھے انسانوں سے نفرت ہے۔ مجھے پاگل خانے کی غلامی بخش دو۔ میں ان سڑکوں کی آزادی نہیں چاہتا۔ سڑک خاموش ہے اور سنسان۔ بلند ٹہنیوں پر گدھ بیٹھے اُونگھ رہے ہیں۔ یہ دو فرلانگ لمبی سڑک۔

(کرشن چندر کے بہترین افسانے: مرتبہ ریوتی سرن شرما۔ اپیندر ناتھ)

◆◆◆

کالو بھنگی

میں نے اس سے پہلے ہزار بار کالو بھنگی کے بارے میں لکھنا چاہا ہے لیکن میرا قلم ہر بار یہ سوچ کر رُک گیا ہے کہ 'کالو بھنگی' کے متعلق لکھا ہی کیا جا سکتا ہے۔ مختلف زاویوں سے میں نے اس کی زندگی کو دیکھنے، پرکھنے سمجھنے کی کوشش کی ہے لیکن کہیں وہ ٹیڑھی لکیر دکھائی نہیں دیتی جس سے دلچسپ افسانہ مرتب ہو سکتا ہے۔ دلچسپ ہونا تو در کنار کوئی سیدھا سادا افسانہ بے کیف و بے رنگ، بے جان مرقع بھی تو نہیں بن سکتا۔ 'کالو بھنگی' کے متعلق، پھر نہ جانے کیا بات ہے، ہر افسانے کے شروع میں میرے ذہن میں 'کالو بھنگی' آن کھڑا ہوتا ہے اور مجھ سے کہتا ہے۔

"چھوٹے صاحب! مجھ پر کہانی نہیں لکھو گے؟ کتنے سال ہو گئے تمھیں لکھتے ہوئے؟"

"آٹھ سال۔"

"کتنی کہانیاں لکھیں تم نے؟"

"ساٹھ اور دو باسٹھ۔"

"مجھ میں کیا بُرائی ہے۔ چھوٹے صاحب تم میرے متعلق کیوں نہیں لکھتے؟ دیکھو کب سے میں اس کہانی کے انتظار میں کھڑا ہوں۔ تمھارے ذہن کے ایک کونے میں مدّت سے ہاتھ باندھے کھڑا ہوں۔ چھوٹے صاحب میں تو تمھارا پرانا حلال خور ہوں، 'کالو بھنگی' آخر تم میرے متعلق کیوں نہیں لکھتے؟"

اور میں کچھ جواب نہیں دے سکتا۔ اس قدر سیدھی سپاٹ زندگی رہی ہے 'کالو بھنگی' کی، کہ میں کچھ بھی تو نہیں لکھ سکتا۔ اس کے متعلق، یہ نہیں کہ اس کے بارے میں کچھ لکھنا ہی نہیں چاہتا۔ دراصل میں 'کالو بھنگی' کے متعلق لکھنے کا ارادہ ایک مدّت سے کر رہا ہوں لیکن کبھی لکھ نہیں سکا۔ ہزار

کوشش کے باوجود نہیں لکھ سکا۔ اسی لیے آج تک 'کالو بھنگی' اپنی پرانی جھاڑو لیے اپنے بڑے بڑے ننگے گھٹنے لیے، اپنے پھٹے پھٹے کھردرے بدصورت پاؤں لیے، اپنی سوکھی ٹانگوں پر اُبھری دریدیں لیے، اپنے کولھوں کی اُبھری اُبھری ہڈیاں لیے، اپنے بھوکے پیٹ اور اس کی خشک جلد کی سیاہ سلوٹیں لیے، اپنے مرجھائے ہوئے سینے پر گردآلود بالوں کی جھاڑیاں لیے، اپنے سکڑے سکڑے ہونٹوں، پیلے پیلے نتھنوں، جھریوں والے گالوں اور اپنی آنکھوں کے نیم تاریک گڑھوں کے اُوپر ننگی چندیا اُبھارے میرے ذہن کے کونے میں کھڑا ہے۔ اب تک کئی کردار آئے اور اپنی زندگی بتا کر اپنی اہمیت جتا کر، اپنی ڈرامائیت ذہن نشین کرا کے چلے گئے۔ حسین عورتیں، خوبصورت تخیلی ہیولے، شیطان کے چہرے، اس ذہن کے رنگ وروغن سے آشنا ہوئے، اس کی چار دیواری میں اپنے دیے جلا کر چلے گئے لیکن 'کالو بھنگی' بدستور جھاڑو سنبھالے اسی طرح کھڑا ہے۔ اُس نے اس گھر کے ہر کردار کو دیکھا ہے۔ اسے روتے ہوئے گڑگڑاتے ہوئے، محبت کرتے ہوئے، نفرت کرتے ہوئے، سوتے ہوئے جاگتے ہوئے، ہنستے گاتے ہوئے، تقریر کرتے ہوئے۔ زندگی کے ہر رنگ میں ہر نہج سے ہر منزل میں دیکھا ہے۔ بچپن سے بڑھاپے سے موت تک۔ اس نے ہر اجنبی کو اس گھر کے دروازے کے اندر جھانکتے دیکھا ہے اور اسے اندر آتے ہوئے دیکھ کر اس کے لیے راستہ صاف کر دیا ہے۔ وہ خود پَرے ہٹ گیا ہے۔ ایک بھنگی کی طرح الگ ہٹ کے کھڑا ہو گیا ہے۔ حتیٰ کہ داستان شروع ہو کر ختم بھی ہو گئی ہے۔ حتیٰ کہ کردار اور تماشائی دونوں رخصت ہو گئے ہیں لیکن 'کالو بھنگی' اس کے بعد بھی وہیں کھڑا ہے۔ اب صرف ایک قدم اس نے اور آگے بڑھا لیا اور ذہن کے مرکز میں آ گیا ہے۔ تاکہ میں اسے اچھی طرح دیکھ لوں۔ اس کی ننگی چندیا چمک رہی ہے اور ہونٹوں پر ایک خاموش سوال ہے۔ ایک عرصے سے میں اسے دیکھ رہا ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا لکھوں گا اس کے بارے میں لیکن آج یہ بھوت ایسے مانے گا نہیں اسے کئی سالوں تک ٹالا ہے۔ آج اسے بھی الوداع کہہ دیں......؟

◆

میں سات برس کا تھا جب میں نے 'کالو بھنگی' کو پہلی بار دیکھا۔ اس کے بیس برس بعد جب وہ مرا، میں نے اسے اس حالت میں دیکھا جس میں اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ کہیں کوئی فرق نہ تھا۔ وہی گھٹنے، وہی پاؤں، وہی رنگت، وہی چہرہ، وہی چندیا، وہی ٹوٹے ہوئے دانت، وہی جھاڑو جو ایسا معلوم ہوتا تھا ماں کے پیٹ ہی سے اُٹھائے چلا آ رہا ہے۔ 'کالو بھنگی' کی جھاڑو اس کے جسم کا

ہی ایک حصہ معلوم ہوتی تھی۔ وہ ہر روز اسپتال میں مریضوں کے بول و براز صاف کرتا تھا۔ ڈسپنسری میں فینائل چھڑکتا تھا پھر ڈاکٹر صاحب اور کمپونڈر صاحب کے بنگلوں میں صفائی کا کام کرتا تھا۔ کمپونڈر صاحب کی بکری اور ڈاکٹر صاحب کی گائے کو چرانے کے لیے جنگل میں لے جاتا اور دن ڈھلتے ہی انھیں واپس اسپتال میں لے آتا اور مویشی خانے میں باندھ کے اپنا کھانا تیار کرتا اور اُسے کھا کے سو جاتا۔ بیس سال سے اسے میں یہی کام کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ ہر روز بلا ناغہ اس عرصے میں وہ کبھی ایک دن کے لیے بھی بیمار نہیں پڑا۔ یہ امر تعجب خیز ضرور تھا لیکن اتنا بھی نہیں کہ محض اسی کے لیے ایک کہانی لکھی جائے۔ خیر یہ کہانی تو زبردستی لکھوائی جا رہی ہے۔ آٹھ سال سے میں اسے ٹالتا آیا ہوں لیکن یہ شخص نہیں مانا۔ زبردستی سے کام لے رہا ہے۔ یہ ظلم مجھ پر بھی ہے اور آپ پر بھی۔ مجھ پر اس لیے کہ مجھے لکھنا پڑ رہا ہے اور آپ پر اس لیے کہ آپ کو اسے پڑھنا پڑ رہا ہے۔ حالانکہ اس میں کوئی ایسی بات نئی نہیں، جس کے لیے اس کے متعلق اتنی سر دردی مول لی جائے مگر کیا کیا جائے؟ 'کالو بھنگی' کی خاموش نگاہوں کے اندر ایک ایسی کھنچی کھنچی سی ملتجیانہ کاوش ہے۔ ایک ایسی مجبور بے زبانی ہے۔ ایک ایسی محبوس گہرائی ہے کہ مجھے اس کے متعلق لکھنا پڑ رہا ہے اور لکھتے لکھتے یہ بھی سوچتا ہوں کہ اس کی زندگی کے متعلق کیا لکھوں گا میں۔ کوئی پہلو بھی تو ایسا نہیں، جو تاریک ہو۔ کوئی زاویہ ایسا نہیں جو مقناطیسی کشش کا حامل ہو۔ ہاں آٹھ سال سے برابر یہ بھنگی میرے ذہن میں کھڑا ہے۔ نہ جانے کیوں؟ اس میں اس کی ہٹ دھرمی کے سوا اور تو مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔ جب میں نے رومانیت سے آگے کا سفر اختیار کیا اور حُسن اور حیوان کی بوقلمونی کیفیتیں دیکھتا ہوا ٹوٹے ہوئے تاروں کو چھونے لگا۔ اس وقت بھی یہ وہیں میرے ذہن کے دروازے پر کھڑا تھا گم صم مگر اب یہ جائے گا ضرور۔ اب کے اسے جانا ہی پڑے گا۔ اب میں اس کے بارے میں لکھ رہا ہوں۔ للہ اس کی بے کیف، بے رنگ، پھیکی میٹھی کہانی بھی سن لیجیے تاکہ یہ یہاں سے دُور دفان ہو جائے اور مجھے اس کے غلیظ قرب سے نجات ملے اور اگر آج بھی مَیں نے اس کے بارے میں نہ لکھا اور نہ آپ نے اسے پڑھا تو یہ آٹھ سال بعد بھی یہیں جما رہے گا اور ممکن ہے زندگی بھر یہیں کھڑا رہے۔

لیکن پریشانی تو یہ ہے کہ اس کے بارے میں کیا لکھا جا سکتا ہے۔

'کالو بھنگی' کے ماں باپ بھنگی تھے اور جہاں تک میرا خیال ہے اس کے سارے آباؤ اجداد بھنگی تھے اور سینکڑوں برس سے یہیں رہتے چلے آئے تھے، اسی طرح اس حالت میں۔ پھر 'کالو

بھنگی' نے شادی نہ کی تھی اس نے کبھی عشق نہ کیا تھا۔ اس نے کبھی دُور دراز کا سفر نہیں کیا تھا۔ حد تو یہ ہے کہ وہ کبھی اپنے گاؤں سے باہر نہیں گیا تھا۔ وہ دن بھر اپنا کام کرتا اور رات کو سو جاتا اور صبح اُٹھ کے پھر اپنے کام میں مصروف ہو جاتا۔ بچپن ہی سے وہ اسی طرح کرتا چلا آیا تھا۔

ہاں 'کالو بھنگی' میں ایک بات ضرور دلچسپ تھی اور وہ یہ کہ اسے اپنی ننگی چندیا پر کسی جانور مثلاً گائے یا بھینس کی زبان پھرانے سے بڑا لطف حاصل ہوتا تھا۔ اکثر دوپہر کے وقت میں نے اسے دیکھا ہے کہ نیلے آسمان تلے، سبز گھاس کے مخملیں فرش پر، کھلی دُھوپ میں وہ اسپتال کے قریب ایک کھیت کی مینڈھ پر بیٹھا ہے اور گائے اس کا سر چاٹ رہی ہے۔ بار بار اور وہ وہیں اپنا سر چٹواتا چٹواتا اونگھ اونگھ کر سو گیا ہے۔ اسے اس طرح سوتے دیکھ کر میرے دل میں مسرت کا ایک عجیب سا احساس اُجاگر ہونے لگتا تھا اور کائنات کے تھکے تھکے غنودگی آمیز آفاقی حسن کا گمان ہونے لگتا تھا۔ میں نے اپنی چھوٹی سی زندگی میں دنیا کی حسین ترین عورتیں، پھولوں کے تازہ ترین غنچے، کائنات کے خوبصورت ترین مناظر دیکھے ہیں لیکن نہ جانے کیوں ایسی معصومیت، ایسا حسن، ایسا سکون کسی منظر میں نہیں دیکھا، جتنا اس منظر میں کہ جب میں سات برس کا تھا اور وہ کھیت بہت بڑا اور وسیع دکھائی دیتا تھا اور آسمان بہت نیلا اور صاف اور 'کالو بھنگی' کی چندیا شیشے کی طرح چمکتی تھی اور گائے کی زبان آہستہ آہستہ اس کی چندیا چاٹتی ہوئی اسے گویا سلاتی ہوئی کُھر کُھر کی خوابیدہ آواز پیدا کرتی جاتی تھی۔ جی چاہتا تھا میں بھی اسی طرح اپنا سر گھٹا کے اس گائے کے نیچے بیٹھ جاؤں اور اونگھتا اونگھتا سو جاؤں۔ ایک دفعہ میں نے ایسا کرنے کی کوشش بھی کی تو والد نے مجھے پیٹا اور مجھ سے زیادہ غریب 'کالو بھنگی' کو پیٹا کہ میں خود ڈر کے مارے چیخنے لگا کہ 'کالو بھنگی' کہیں ان کی ٹھوکروں سے مر نہ جائے لیکن 'کالو بھنگی' کو اتنی مار کھا کے بھی کچھ نہ ہوا، دوسرے روز بدستور جھاڑو دینے کے لیے ہمارے بنگلے میں موجود تھا۔

کالو بھنگی کو جانوروں سے بڑا لگاؤ تھا۔ ہماری گائے تو اس پر جان چھڑکتی تھی اور کمپاؤنڈر صاحب کی بکری بھی۔ حالانکہ بکری بڑی بے وفا ہوتی ہے۔ عورت سے بھی بڑھ کے لیکن 'کالو بھنگی' کی بات اور تھی۔ ان دونوں جانوروں کو پانی پلائے تو کالو بھنگی، چارا کھلائے تو کالو بھنگی، جنگل میں چرائے تو 'کالو بھنگی' اور رات کو مویشی خانے میں باندھے تو کالو بھنگی۔ وہ اس کے ایک ایک اشارے کو اس طرح سمجھ جاتیں جس طرح کوئی انسان کسی انسان کے بچّے کی باتیں سمجھتا ہے۔ میں کئی بار کالو بھنگی کے پیچھے گیا ہوں۔ جنگل میں راستے میں وہ انھیں بالکل کھلا چھوڑ دیتا تھا لیکن پھر

بھی گائے اور بکری دونوں اس کے ساتھ قدم سے قدم ملائے چلے آتے تھے۔ گویا تین دوست سیر کرنے کے لیے نکلے ہیں۔ راستے میں گائے نے سبز گھاس دیکھ کے منہ مارا تو بکری بھی جھاڑی سے پتیاں کھانے لگتی اور کالو بھنگی ہے کہ سنبھلو توڑ توڑ کے کھا رہا ہے اور بکری کے منہ میں ڈال رہا ہے اور خود بھی کھا رہا ہے اور آپ ہی آپ باتیں کر رہا ہے اور ان سے بھی برابر باتیں کیے جا رہا ہے اور وہ دونوں جانور بھی کبھی غرا کر کبھی کان پھٹپھٹا کر، کبھی پاؤں ہلا کر، کبھی دُم دبا کر، کبھی ناچ کر، کبھی گا کر، ہر طرح سے اس کی گفتگو میں شریک ہو رہے ہیں، اپنی سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا تھا کہ یہ لوگ کیا باتیں کرتے تھے۔ پھر چند لمحوں کے بعد کالو بھنگی آگے چلنے لگتا تو گائے بھی چرنا چھوڑ دیتی اور بکری بھی جھاڑی سے پرے ہٹ جاتی اور کالو بھنگی کے ساتھ ساتھ چلنے لگتی۔ آگے کہیں چھوٹی سی ندی آتی یا کوئی ننھا ننھا چشمہ تو کالو بھنگی وہیں بیٹھ جاتا بلکہ لیٹ کر وہیں چشمے کی سطح سے اپنے ہونٹ ملا دیتا اور جانوروں کی طرح پانی پینے لگتا اور اسی طرح وہ دونوں جانور بھی پانی پینے لگتے۔ کیوں کہ بے چارے انسان تو نہیں تھے کہ اوک سے پی سکتے۔ اس کے بعد اگر کالو بھنگی سبزے پر لیٹ جاتا تو بکری بھی اس کی ٹانگوں کے پاس اپنی ٹانگیں سکیڑ کے دعائیہ انداز میں بیٹھ جاتی اور گائے تو اس انداز سے اس کے قریب ہو بیٹھتی کہ مجھے ایسا معلوم ہوتا کہ وہ کالو بھنگی کی بیوی ہے اور ابھی ابھی کھانا پکا کے فارغ ہوئی ہے۔ اس کی ہر نگاہ میں اور پھرے کے ہر اُتار چڑھاؤ میں ایک سکون آمیز گرہستی انداز جھلکنے لگتا اور جب وہ جگالی کرنے لگتی تو مجھے معلوم ہوتا گویا کوئی بڑی سگھڑ بیوی کروشیا لیے سوزن کاری میں مصروف ہے اور کالو بھنگی کے لیے سوئیٹر بُن رہی ہے۔

اس گائے اور بکری کے علاوہ ایک لنگڑا کتا تھا جو کالو بھنگی کا بڑا دوست تھا۔ وہ لنگڑا تھا اور اس لیے دوسرے کتوں کے ساتھ زیادہ چل پھر نہ سکتا تھا اور اکثر اپنے لنگڑے ہونے کی وجہ سے دوسرے کتوں سے پٹتا، بھوکا رہتا اور زخمی رہتا۔ کالو بھنگی اکثر اس کی تیمارداری اور خاطر تواضع میں لگا رہتا۔ کبھی تو صابن سے اُسے نہلاتا، کبھی اس کی چچڑیاں دُور کرتا، اس کے زخموں کو مرہم لگاتا۔ اسے مکئی کی روٹی کا سوکھا ٹکڑا دیتا لیکن یہ کتا بڑا خود غرض جانور تھا۔ دن میں صرف دو مرتبہ کالو بھنگی سے آ کے ملتا تھا۔ دوپہر کو اور شام کو اور کھانا کھا کے اور اپنے زخموں پر مرہم لگوا کے پھر گھومنے کے لیے چلا جاتا۔ کالو بھنگی اور اس لنگڑے کتے کی ملاقات بڑی مختصر ہوتی تھی اور بڑی دلچسپ۔ مجھے تو وہ کتا ایک آنکھ نہ بھاتا تھا لیکن کالو بھنگی اس سے ہمیشہ بڑے تپاک سے ملتا تھا۔ اس کے علاوہ کالو بھنگی کی جنگل کے ہر جانور چرند اور پرند سے شناسائی تھی۔ راستے میں اس کے پاؤں میں کوئی کیڑا

آ جاتا تو اسے اُٹھا کر جھاڑی پر رکھ دیتا۔ کہیں سے نیولہ بولنے لگتا تو یہ اس کی بولی میں اس کا جواب دیتا۔ تیتر، رستنگلہ، گٹاری، لال چڑا، سبزہ تجی ہر پرندے کی زبان وہ جانتا تھا۔ اس لحاظ سے وہ راہل سنکر تائین سے بھی کہیں بڑا مہا پنڈت تھا۔ کم از کم میرے جیسے سات برس کے بچے کو تو وہ اپنے ماں باپ سے بھی اچھا معلوم ہوتا تھا اور پھر وہ مکّی کا بھٹہ ایسے مزے کا تیار کرتا تھا اور آگ پر اُسے اس طرح مدھم آنچ میں بھونتا تھا کہ مکّی کا ہر دانہ کندن بن جاتا اور ذائقے میں شہد کا مزہ دیتا اور خوشبو بھی ایسی سوندھی سوندھی، میٹھی میٹھی جیسے دھرتی کی سانس! نہایت آہستہ آہستہ بڑے سکون سے، بڑی مشاقی سے وہ بھٹے کو ہر طرف سے دیکھ کے ایسے بھونتا تھا جیسے وہ برسوں سے اس بھٹے کو جانتا ہے۔ اِک دوست کی طرح وہ بھٹے سے باتیں کرتا۔ اتنی نرمی، مہربانی اور شفقت سے اس سے پیش آتا۔ گویا وہ اس کا اپنا رشتہ دار یا سگا بھائی تھا، اور لوگ بھی بھٹہ بھونتے تھے مگر وہ بات کہاں؟ اس قدر کچے بدذائقہ اور معمولی سے بھٹے وہ ہوتے تھے کہ انھیں بس مکّی کا بھٹا ہی کہا جاسکتا ہے لیکن کالو بھنگی کے ہاتھوں میں پہنچ کر وہی بھٹا کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے اور جب وہ آگ پر سینک کر بالکل تیار ہو جاتا تو بالکل ایک نئی نویلی دلہن کی طرح عروسی لباس پہنے سنہرا سنہرا چمکتا نظر آتا تھا۔ میرے خیال میں خود بھٹے کو یہ اندازہ ہو جاتا تھا کہ کالو اس سے کتنی محبت کرتا ہے ورنہ محبت کے بغیر اس بے جان شے میں اتنی رعنائی کیسے پیدا ہو سکتی تھی۔ مجھے کالو بھنگی کے ہاتھ کے سینکے ہوئے بھٹے کھانے میں بڑا مزا آتا تھا اور میں انھیں بڑے مزے میں چھپ چھپ کر کھاتا تھا۔ ایک دفعہ پکڑا گیا تو بڑی ٹھکائی ہوئی۔ میری طرح بیچارہ کالو بھنگی بھی خوب خوب پٹا مگر دوسرے دن وہ پھر بنگلے پر جھاڑو لیے اسی طرح حاضر تھا۔

اور بس کالو بھنگی کے متعلق مجھے اور کوئی دلچسپ بات یاد نہیں آرہی۔ میں بچپن سے جوانی میں آیا اور کالو بھنگی اسی طرح رہا۔ میرے لیے اب وہ کم دلچسپ ہو گیا تھا بلکہ یوں کہیے کہ مجھے اس سے کسی طرح کی دلچسپی نہ رہی تھی۔ ہاں کبھی کبھی اس کا کردار مجھے اپنی طرف کھینچتا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں نے نیا نیا لکھنا شروع کیا تھا۔ میں مطالعے کے لیے اس سے سوال پوچھتا اور نوٹ لینے کے لیے قلم اور پیڈ ساتھ رکھ لیتا۔

''کالو بھنگی تمھاری زندگی میں کوئی خاص بات ہے۔''

''کیسے چھوٹے صاحب۔''

''کوئی خاص بات۔ عجیب انوکھی، نئی۔''

''نہیں چھوٹے صاحب'' (یہاں تک مشاہدہ صفر رہا۔ اب آگے چلیے ......!)

''اچھا یہ بتاؤ تم تنخواہ لے کر کیا کرتے ہو؟'' میں نے دوسرا سوال پوچھا۔

''تنخواہ لے کر کیا کرتا ہوں۔'' وہ سوچنے لگتا۔ ''آٹھ روپے ملتے ہیں مجھے۔'' پھر وہ انگلیوں پر گننے لگتا۔ ''چار روپے کا آٹا لاتا ہوں۔ ایک روپے کا تمباکو۔ آٹھ آنے کی چائے۔ چار آنے کا گڑ، چار آنے کا مصالحہ، کتنے روپے ہو گئے چھوٹے صاحب!''

''سات روپے۔''

''ہاں سات روپے، ہر مہینے ایک روپیہ بنیے کو دیتا ہوں۔ اس سے کپڑے سلوانے کے لیے روپے قرض لیتا ہوں نا۔ سال میں دو جوڑے تو چاہئیں۔ کمبل تو میرے پاس ہے۔ خیر، لیکن دو جوڑے تو چاہئیں۔ اور چھوٹے صاحب! کہیں بڑے صاحب ایک روپیہ تنخواہ بڑھا دیں تو مجا آ جائے۔''

''وہ کیسے؟''

''گھی لاؤں گا ایک روپے کا اور مکی کے پراٹھے کھاؤں گا۔ کبھی پراٹھے نہیں کھائے مالک۔ بڑا جی چاہتا ہے!''

اب بولیے ان آٹھ روپوں پر کوئی کیا افسانہ لکھے۔

پھر جب میری شادی ہو گئی۔ جب راتیں جوان اور چمکدار ہونے لگتیں اور قریب کے جنگل سے شہد اور کستوری اور جنگلی گلاب کی خوشبوئیں آنے لگتیں اور ہرن چوکڑیاں بھرتے ہوئے دکھائی دیتے اور تارے جھکتے جھکتے کانوں میں سرگوشیاں سی کرنے لگتے اور کسی کے رسیلے ہونٹ آنے والے بوسوں کا خیال کر کے کانپنے لگتے۔ اس وقت بھی مَیں کالو بھنگی کے متعلق کچھ لکھنا چاہتا اور پنسل کاغذ لے کے اس کے پاس جاتا۔

''کالو بھنگی تم نے بیاہ نہیں کیا؟''

''نہیں چھوٹے صاحب۔''

''کیوں؟''

''اس علاقے میں مَیں ہی ایک بھنگی ہوں اور دُور دُور تک کوئی بھنگی نہیں ہے۔ چھوٹے صاحب پھر ہماری شادی کیسے ہو سکتی ہے!'' (لیجیے یہ راستہ بھی بند ہوا)

''تمھارا جی نہیں چاہتا، کالو بھنگی؟'' میں نے دوبارہ کوشش کر کے کچھ کریدنا چاہا۔

"کیا صاحب؟"

"عشق کرنے کے لیے جی چاہتا ہے تمھارا؟ شاید کسی سے محبت کی ہو گی تم نے۔ جبھی تم نے اب تک شادی نہیں کی۔"

"عشق کیا ہوتا ہے۔ چھوٹے صاحب؟"

"عورت سے عشق کرتے ہیں لوگ؟"

"عشق کیسے کرتے ہیں صاحب! شادی تو ضرور کرتے ہیں سب لوگ بڑے لوگ عشق بھی کرتے ہوں گے چھوٹے صاحب، مگر ہم نے نہیں سنا۔ وہ جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں۔ رہی شادی کی بات وہ میں نے آپ کو بتا دی۔ شادی کیوں نہیں کی مَیں نے۔ کیسے ہوتی شادی میری۔ آپ ہی بتائیے؟"

"ہم کیا بتائیں خاک۔"

"تمھیں افسوس نہیں ہے کالو بھنگی؟"

کس بات کا افسوس چھوٹے صاحب؟"

"میں نے ہار کر اس کے متعلق لکھنے کا خیال چھوڑ دیا۔

◆

آٹھ سال ہوئے کالو بھنگی مر گیا۔ وہ جو کبھی بھی بیمار نہیں ہوا تھا۔ اچانک ایسا بیمار پڑا کہ پھر کبھی بستر علالت سے نہ اُٹھا۔ اُسے اسپتال میں مریض رکھوا دیا تھا۔ وہ الگ وارڈ میں رہتا تھا، کمپاؤنڈر دُور سے اس کے حلق میں دوا اُنڈیل دیتا اور ایک چپراسی اس کے لیے کھانا رکھ آتا۔ وہ اپنے برتن خود صاف کرتا۔ اپنا بستر خود کرتا۔ اپنا بول و براز خود صاف کرتا اور جب وہ مر گیا تو اس کی نعش کو پولیس والوں نے ٹھکانے لگا دیا۔ کیوں کہ اس کا کوئی وارث نہ تھا۔ وہ ہمارے ہاں بیس سال سے رہتا تھا لیکن ہم کوئی اس کے رشتے دار تھوڑی تھے۔ اس لیے اس کی آخری تنخواہ مبلغ آٹھ روپے بھی بحق سرکار ضبط ہو گئی۔ کیوں کہ اس کا کوئی وارث نہ تھا اور جب وہ مرا اس روز بھی کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ روز کی طرح اس روز بھی اسپتال کھلا۔ ڈاکٹر صاحب نے نسخے لکھے۔ کمپاؤنڈر نے تیار کیے۔ مریضوں نے دوا لی اور گھر لوٹ گئے۔ پھر روز کی طرح اسپتال بند بھی ہوا اور گھر آن کر ہم سب نے آرام سے کھانا کھایا۔ ریڈیو سُنا اور لحاف اوڑھ کر سو گئے۔ اُٹھے تو پتہ چلا کہ پولیس والوں نے ازراہ کرم کالو بھنگی کی لاش ٹھکانے لگوا دی۔ البتہ ڈاکٹر صاحب کی گائے نے

اور کمپاؤنڈر صاحب کی بکری نے دو روز تک نہ کچھ کھایا نہ پیا اور وارڈ کے باہر کھڑے کھڑے بے کار چلاتی رہیں۔ جانور کی ذات ہے نا آخر!

○

ارے تو پھر جھاڑو لے کر آن پہنچا! آخر کیا چاہتا ہے؟ بتا رے۔

کالو بھنگی ابھی تک وہیں کھڑا ہے۔

کیوں بھئی اب تو میں نے سب کچھ لکھ دیا ہے وہ سب کچھ جو میں تمھاری بابت جانتا ہوں۔ اب بھی یہیں کھڑے ہو۔ پریشان کر رہے ہو۔ للہ چلے جاؤ۔ کیا کہیں مجھ سے کچھ چھوٹ گیا ہے، کوئی بھول ہو گئی ہے؟ تمھارا نام، کالو بھنگی، کام بھنگی، اس علاقے سے کبھی باہر نہیں گئے۔ شادی نہیں کی۔ عشق نہیں لڑایا۔ زندگی میں کوئی ہنگامی بات نہیں ہوئی، کوئی اچنبھا...... معجزہ نہیں ہوا۔ جیسے محبوبہ کے ہونٹوں میں ہوتا ہے۔ اپنے بچے کے پیار میں ہوتا ہے۔ غالبؔ کے کلام میں ہوتا ہے۔ کچھ بھی تو نہیں ہوا تمھاری زندگی میں۔ پھر میں کیا لکھوں اور کیا نہ لکھوں؟ تمھاری تنخواہ آٹھ روپے، چار روپے کا آٹا، ایک روپے کا نمک، ایک روپے کا تمباکو، آٹھ آنے کی چائے، چار آنے کا مصالحہ، چار آنے کا گڑ، سات روپے۔ اور ایک روپیہ بنیے کا، آٹھ روپے ہو گئے مگر آٹھ روپے میں تو کہانی نہیں ہوتی۔ آج کل تو پچیس، پچاس، سو روپے میں نہیں ہوتی مگر آٹھ روپے میں تو شرطیہ کوئی کہانی نہیں ہو سکتی۔ پھر میں کیا لکھ سکتا ہوں تمھارے بارے میں؟ اب خلجی ہی کو لو۔ اسپتال میں کمپاؤنڈر ہے۔ بتیس روپے تنخواہ پاتا ہے۔ وراثت سے نچلے متوسط طبقے کے ماں باپ ملے تھے جنھوں نے مڈل تک پڑھا دیا۔ پھر خلجی نے کمپاؤنڈری کا امتحان پاس کر لیا۔ وہ جوان ہے۔ اس کے چہرے پر رنگت ہے۔ یہ جوانی، یہ رنگت کچھ چاہتی ہے۔ وہ سفید لٹھے کی شلوار پہن سکتا ہے۔ قمیص پر کلف لگا سکتا ہے، بالوں میں خوشبودار تیل لگا کر کنگھی کر سکتا ہے۔ سرکار نے اسے رہنے کے لیے ایک چھوٹا بنگلہ نما کوارٹر بھی دے رکھا ہے۔ ڈاکٹر چوک جائے تو فیس بھی جھاڑ لیتا ہے اور خوبصورت مریضوں سے عشق بھی کر لیتا ہے۔ وہ نوراں اور خلجی کا واقعہ تمھیں یاد ہوگا۔ نوراں بھتیا سے آئی تھی۔ سولہ سترہ برس کی الہڑ جوانی چار کوس سے کسی سینما کے رنگین اشتہار کی طرح نظر آ جاتی تھی، بڑی بے وقوف تھی وہ، اپنے گاؤں کے دونو جوانوں کا عشق قبول کیے بیٹھی تھی۔ جب نمبردار کا لڑکا سامنے آ جاتا تو اس کی ہو جاتی اور جب پٹواری کا لڑکا دکھائی دیتا تو اس کا دل اس کی طرف مائل ہونے لگتا اور وہ کوئی فیصلہ ہی نہیں کر سکتی تھی۔ بالعموم عشق کو لوگ ایک بالکل واضح قاطع یقینی

امر سمجھتے ہیں حالانکہ یہ عشق اکثر بڑا متذبذب و غیر یقینی، گومگو حالت کا حامل ہوتا ہے۔ یعنی عشق اُس سے بھی ہے، اِس سے بھی ہے اور پھر شاید کہیں نہیں ہے اور ہے بھی تو اس قدر وقتی، گڑگئی، ہنگامی، کہ ادھر نظر چوکی اُدھر عشق غائب۔ سچائی ضرور ہوتی ہے لیکن ابدیت مفقود ہوتی ہے۔ اسی لیے تو نوراں کوئی فیصلہ نہیں کر پاتی تھی۔ اس کا دل نمبردار کے بیٹے کے لیے بھی دھڑکتا تھا اور پٹواری کے پوت کے لیے بھی، اُس کے ہونٹ نمبردار کے بیٹے کے ہونٹوں سے مل جانے کے لیے بے تاب ہو اُٹھتے اور پٹواری کے پوت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہی اس کا دل یوں کانپنے لگتا جیسے چاروں طرف سمندر ہو۔ لہریں ہوا اور ایک اکیلی کشتی ہو اور نازک سی پتوار ہو اور چاروں طرف کوئی نہ ہو اور کشتی ڈولنے لگے، ہولے ہولے ڈولتی جائے اور نازک سی پتوار نازک سے ہاتھوں سے ہلتی ہلتی تھم جائے اور سانس رُکتے رُکتے رُک سی جائے اور آنکھیں جھکتی جھکتی جھک سی جائیں اور زلفیں بکھرتی بکھرتی بکھری سی جائیں اور لہریں گھوم گھوم کر گھومتی ہوئی معلوم ہوں اور بڑے بڑے دائرے پھیلتے پھیلتے پھیل جائیں اور پھر چاروں طرف سناٹا پھیل جائے اور دل ایک دم دھک سے رہ جائے اور کوئی اپنی بانہوں میں بھینچ لے۔ ہائے۔ پٹواری کے بیٹے کو دیکھتے ہی ایسی ہی حالت ہوتی تھی نوراں کی اور وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکتی۔ نمبردار کا بیٹا، پٹواری کا بیٹا۔ پٹواری کا بیٹا، نمبردار کا بیٹا، وہ دونوں کو زبان دے چکی تھی۔ دونوں سے شادی کرنے کا اقرار کر چکی تھی، دونوں پر مر مٹی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں آپس میں لڑتے لڑتے لہولہان ہو گئے اور جب جوانی کا بہت سا لہو رگوں سے نکل گیا تو انھیں اپنی بیوقوفی پر بڑا غصہ آیا اور پہلے نمبردار کا بیٹا نوراں کے پاس پہنچا اور اپنی چھری سے اُسے ہلاک کرنا چاہا اور نوراں کے بازو پر زخم آئے اور پھر پٹواری کا پوت آیا اور اس نے اس کی جان لینی چاہی اور نوراں کے پاؤں پر زخم آئے مگر وہ بچ گئی، کیوں کہ وہ بروقت اسپتال لائی گئی تھی اور یہاں اس کا علاج شروع ہو گیا۔ آخر اسپتال والے بھی انسان ہوتے ہیں۔ خوبصورتی دِلوں پر اثر کرتی ہے۔ انجکشن کی طرح۔ تھوڑا بہت اس کا اثر ضرور ہوتا ہے کسی پر کم کسی پر زیادہ۔ ڈاکٹر صاحب پر کم تھا کمپاؤنڈر پر زیادہ۔ نوراں سے پہلے بیگماں اور بیگماں سے پہلے ریشماں اور ریشماں سے پہلے جانکی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ مگر وہ خلجی کے ناکام معاشقے تھے کیوں کہ وہ عورتیں بیاہی ہوئی تھیں۔ ریشماں کا تو ایک بچہ بھی تھا۔ بچوں کے علاوہ ماں باپ تھے اور خاوند تھا اور خاوندوں کی دشمن نگاہیں تھیں جو گویا خلجی کے سینے کے اندر گھس کے اس کو خواہشوں کے آخری کونے تک پہنچ جانا چاہتی تھیں۔ خلجی کیا کر سکتا تھا؟ مجبور ہو کے رہ جاتا۔ اس نے بیگماں سے عشق

کیا۔ ریشماں سے اور جانکی سے بھی۔ وہ ہر روز بیگماں کے بھائی کو مٹھائی کھلاتا۔ ریشماں کے ننھے بیٹے کو دن بھر اُٹھائے پھرتا تھا۔ جانکی کو پھولوں سے بڑی محبت تھی۔ وہ ہر روز صبح اُٹھ کر منہ اندھیرے جنگل کی طرف نکل جاتا اور خوبصورت لالہ کے گچھے توڑ کر اس کے لیے لاتا۔ بہترین دوائیں، بہترین غذائیں، بہترین تیمارداری لیکن وقت آنے پر جب بیگماں اچھی ہوئی تو روتے روتے اپنے خاوند کے ساتھ چلی گئی اور جب ریشماں اچھی ہوئی تو اپنے بیٹے کو لے کے چلی گئی اور جانکی اچھی ہوئی تو چلتے وقت اس نے خلجی کے دیے ہوئے پھول اپنے سینے سے لگا لیے۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور پھر اس نے اپنے خاوند کا ہاتھ تھام لیا اور چلتے چلتے گھاٹی کی اوٹ میں غائب ہوگئی۔ گھاٹی کے آخری کنارے پر پہنچ کے اس نے مڑ کر خلجی کی طرف دیکھا اور خلجی منہ پھیر کر وارڈ کی دیوار سے لگ کر رونے لگا۔ ریشماں کے رخصت ہوتے وقت بھی وہ اسی طرح رویا تھا۔ بیگماں کے جاتے وقت بھی اسی شدّت، اسی خلوص، اسی اذیت کے کربناک احساس سے مجبور ہو کر رویا تھا لیکن خلجی کے لیے نہ ریشماں رُکی نہ بیگماں نہ جانکی اور پھر اب کتنے سالوں کے بعد نوراں آئی تھی اور اس کا دل اسی طرح دھڑکنے لگا تھا اور یہ دھڑکن روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔

شروع شروع میں تو نوراں کی حالت غیر تھی۔ اس کا بچنا محال تھا مگر خلجی کی انتھک کوششوں سے زخم بھرتے چلے گئے۔ پیپ کم ہوتی گئی۔ سڑاند دُور ہوتی گئی۔ سوجن غائب ہوتی گئی۔ نوراں کی آنکھوں میں چمک اس کے سپید چہرے پر صحت کی سرخی آئی گئی اور جس روز خلجی نے اس کے بازوؤں کی پٹی اُتاری تو نوراں بے اختیار اس اظہارِ تشکّر کے ساتھ اس کے سینے سے لپٹ کر رونے لگی اور جب اس کے پاؤں کی پٹی اُتری اور اس نے اپنے پاؤں میں مہندی رچائی اور ہاتھوں پر اور آنکھوں میں کاجل لگایا اور زلفیں سنواریں تو خلجی کا دل مسرّت سے چوکڑیاں بھرنے لگا۔

نوراں خلجی کو دل دے بیٹھی تھی، اس نے خلجی سے شادی کا وعدہ کر لیا تھا۔ نمبردار کا بیٹا اور پٹواری کا بیٹا دونوں باری باری کئی دفعہ اسے دیکھنے کے لیے، اس سے معافی مانگنے کے لیے، اُس سے شادی کا پیمان کرنے کے لیے اسپتال آئے تھے اور نوراں انھیں دیکھ کر ہر بار گھبرا جاتی۔ کانپنے لگتی مڑ مڑ کر دیکھنے لگتی اور اس وقت تک اسے چین نہ آتا جب تک وہ لوگ چلے نہ جاتے اور خلجی اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں نہ لے لیتا اور جب وہ بالکل اچھی ہوگئی تو سارا گاؤں اس کا اپنا گاؤں اسے دیکھنے کے لیے اُمڈ پڑا۔ گاؤں کی چھوری اچھی ہوگئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب اور کمپاؤنڈر صاحب

کی مہربانی سے اور نوراں کے ماں باپ بچ جاتے تھے اور آج تو نمبردار بھی آیا تھا اور پٹواری بھی اور وہ دونوں خردماغ لڑکے بھی جو اَب نوراں کو دیکھ دیکھ کے اپنے کیے پر پشیمان ہو رہے تھے اور پھر نوراں نے اپنی ماں کا سہارا لیا اور کاجل میں تیرتی ہوئی ڈبڈبائی آنکھوں سے خلجی کی طرف دیکھا اور چپ چاپ اپنے گاؤں چلی گئی۔ سارا گاؤں اُسے لینے کے لیے آیا تھا اور اس کے قدموں کے پیچھے نمبردار کے بیٹے، اور پٹواری کے بیٹے کے قدم تھے اور یہ قدم اور دوسرے قدم اور دوسرے قدم اور سینکڑوں قدم جو نوراں کے ساتھ چل رہے تھے۔ خلجی کے سینے کی گھاٹی پر سے گزرتے گئے اور پیچھے ایک دھندلی فرو غبار سے اَٹی رہ گزر چھوڑ گئے

اور کوئی وارڈ کی دیوار کے ساتھ لگ کے سسکیاں لینے لگا۔

بڑی خوبصورت اور رومانی زندگی تھی خلجی کی...... خلجی، جو مڈل پاس تھا۔ بتیس روپے تنخواہ پاتا تھا۔ پندرہ بیس اُوپر سے کما لیتا تھا۔ خلجی جو جوان تھا جو محبت کرتا تھا۔ جو ایک چھوٹے سے بنگلے میں رہتا تھا۔ جو اچھے ادیبوں کے افسانے پڑھتا تھا اور عشق میں روتا تھا۔ کس قدر دلچسپ اور رومانی اور پُرکیف زندگی تھی خلجی کی لیکن کالو بھنگی کے متعلق میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ سوائے اس کے کہ:

(۱) کالو بھنگی نے بیگماں کی لہو اور پیپ سے بھری ہوئی پٹیاں دھوئیں۔

(۲) کالو بھنگی نے بیگماں کا بول و براز صاف کیا۔

(۳) کالو بھنگی نے ریشماں کی غلیظ پٹیاں صاف کیں۔

(۴) کالو بھنگی نے جانکی کی گندی پٹیاں دھوئیں اور ہر روز اس کے کمرے میں فینائل چھڑکتا رہا۔ اور شام سے پہلے وارڈ کی کھڑکی بند کرتا رہا اور آتشدان میں لکڑیاں جلاتا رہا تاکہ جانکی کو سردی نہ لگے۔

(۵) کالو بھنگی ریشماں کے بیٹے کو بھٹے کھلاتا رہا۔

(۶) کالو بھنگی نوراں کا پاخانہ اُٹھاتا رہا۔ تین ماہ دس روز تک۔

کالو بھنگی نے ریشماں کو جاتے ہوئے دیکھا۔ اس نے بیگماں کو جاتے ہوئے دیکھا۔ اس نے جانکی کو جاتے ہوئے دیکھا۔ اس نے نوراں کو جاتے ہوئے دیکھا لیکن وہ کبھی دیوار سے لگ کر نہیں رویا۔ وہ پہلے تو دو ایک لمحوں کے لیے حیران ہو جاتا۔ پھر اسی حیرت سے اپنا سر کھجانے لگتا اور جب کوئی بات اس کی سمجھ میں نہ آتی تو وہ اسپتال کے نیچے کھیتوں میں چلا جاتا اور گائے سے اپنی چندیا چٹوانے لگتا لیکن اس کا ذکر تو میں پہلے کر چکا ہوں۔ پھر اور کیا لکھوں تمھارے بارے میں کالو

بھنگی۔ سب کچھ تو کہہ دیا جو کچھ کہنا تھا۔ جو کچھ تم کہہ رہے ہو۔ تمھاری تنخواہ بتیس روپے ہوتی۔ تم مڈل پاس ہوتے تمھیں وراثت میں کچھ کلچر، تہذیب، کچھ تھوڑی سی انسانیت اور مسرّت اور اس مسرّت کی بلندی ملی ہوتی تو میں تمھارے متعلق کوئی کہانی لکھتا۔ اب تمھارے آٹھ روپوں میں کیا کہانی لکھوں۔ ہر بار ان آٹھ روپوں کو الٹ پلٹ کے دیکھتا ہوں۔ چار روپے کا آٹا۔ ایک روپے کا نمک۔ ایک روپے کا تمباکو، آٹھ آنے کی چائے، چار آنے کا گڑ۔ چار آنے کا مصالحہ سات روپے۔ ایک روپیہ بنیے کا، آٹھ روپے ہوگئے۔ کیسے کہانی بنے گی تمھاری، کالو بھنگی، تمھارا افسانہ مجھ سے نہیں لکھا جائے گا۔ چلے جاؤ۔ دیکھو میں تمھارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔

مگر یہ منحوس ابھی تک یہیں کھڑا ہے۔ اپنے اُکھڑے اُکھڑے پیلے پیلے گندے دانت نکالے اپنی پھوٹی ہنسی ہنس رہا ہے۔

تو ایسے نہیں جائے گا۔ اچھا بھئی اب میں پھر اپنی یادوں کی راکھ کریدتا ہوں۔ شاید تیرے لیے کوئی چنگاری نکل آئے۔ شاید اب تیرے لیے مجھے بتیس روپوں سے نیچے اُترنا پڑے گا اور بختیار چپراسی کا آسرا لینا پڑے گا۔ بختیار چپراسی کو پندرہ روپے تنخواہ ملتی ہے اور جب کبھی وہ ڈاکٹر یا کمپونڈر یا ویکسی نیٹر کے ہمراہ دورے پر جاتا ہے تو اسے ڈبل بھتہ اور سفر خرچ بھی ملتا ہے۔ پھر گاؤں میں اس کی اپنی زمین بھی ہے اور ایک چھوٹا سا مکان بھی ہے جس کے تین طرف چیل کے بلند و بالا درخت ہیں اور چوتھی طرف ایک خوبصورت سا باغیچہ ہے جو اس کی بیوی نے لگایا ہے۔ اس میں اس نے کڑم کا ساگ بویا ہے اور پالک اور مولیاں اور شلغم اور سبز مرچیں اور کدو جو گرمیوں کی دُھوپ میں سکھائے جاتے ہیں اور سردیوں میں جب برف پڑتی ہے اور سبزہ مرجاتا ہے تو کھائے جاتے ہیں۔ بختیار کی بیوی یہ سب کچھ جانتی ہے۔

بختیار کے تین بچے ہیں۔ اس کی بوڑھی ماں ہے جو ہمیشہ اپنی بہو سے جھگڑا کرتی رہتی ہے۔ ایک دفعہ بختیار کی ماں اپنی بہو سے جھگڑا کر کے گھر سے چلی گئی تھی۔ اس روز گہرا ابر آسمان پر چھایا ہوا تھا اور سردی کے مارے دانت بج رہے تھے اور گھر سے بختیار کا بڑا لڑکا اماں کے چلے جانے کی خبر لے کر دوڑتا دوڑتا ہسپتال آیا تھا اور بختیار اسی وقت اپنی ماں کو واپس لانے کے لیے کالو بھنگی کو ساتھ لے کر چل دیا تھا۔ وہ دن بھر جنگل میں اسے ڈھونڈتے رہے۔ وہ اور کالو بھنگی اور بختیار کی بیوی، جو اب اپنے کیے پر پریشان تھی اور اپنی ساس کو اُونچی آوازیں دے دے کر روتی جاتی تھی۔ آسمان ابر آلود تھا اور سردی سے ہاتھ پاؤں شل ہوئے جاتے تھے اور پاؤں تلے چیل کے خشک

جھوم پھسلے جاتے تھے۔ پھر بارش شروع ہوگئی۔ پھر کریری پڑنے لگی اور چاروں طرف گہری خاموشی چھا گئی اور جیسے ایک گہری موت نے اپنے دروازے کھول دیے ہوئے ہوں اور برف کی پریوں کو قطار اندر قطار باہر زمین پر بھیج دیا ہو۔ برف کے گالے زمین پر گرتے گئے۔ ساکن خاموش بے آواز سپید مخمل گھاٹیوں وادیوں، چوٹیوں پر پھیل گئی۔

''اماں۔'' بختیار کی بیوی زور سے چلائی۔

''اماں۔'' بختیار چلاّیا۔

''اماں۔'' کالو بھنگی نے آواز دی۔

جنگل گونج گونج کے خاموش ہوگیا۔

کالو بھنگی نے کہا۔ ''میرا خیال ہے وہ نکڑ گئی ہوگی۔ تمھارے ماموں کے پاس۔''

نکڑ کے دو کوس ادھر انھیں بختیار کی اماں ملی۔ برف گر رہی تھی اور وہ چلی جا رہی تھی۔ گرتی پڑتی۔ لڑھکتی ٹھٹھکتی، ہانپتی کانپتی آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی اور جب بختیار نے اسے پکڑا تو اس نے ایک لمحے کے لیے مزاحمت کی۔ پھر وہ اس کے بازوؤں میں گر کر بے ہوش ہوگئی اور بختیار کی بیوی نے اُسے تھام لیا اور راستے بھر وہ اسے باری باری سے اُٹھاتے چلے آئے، بختیار اور کالو بھنگی اور جب وہ لوگ گھر واپس پہنچے تو بالکل اندھیرا ہو چلا تھا اور انھیں واپس آتے دیکھ کر بچے رونے لگے اور کالو بھنگی بھی ایک طرف ہو کے کھڑا ہوگیا اور اپنا سر کھجانے لگا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ پھر اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور وہاں سے چلا آیا۔ ہاں بختیار کی زندگی میں بھی افسانے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے خوبصورت افسانے مگر کالو بھنگی مَیں تمھارے متعلق اور کیا لکھ سکتا ہوں۔ میں اسپتال کے ہر شخص کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور لکھ سکتا ہوں لیکن تمھارے متعلق اتنا کچھ کریدنے کے بعد بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ تمھارا کیا کیا جائے۔ خدا کے لیے اب تو چلے جاؤ۔ بہت ستا لیا تم نے۔

لیکن مجھے معلوم ہے یہ نہیں جائے گا۔ اسی طرح میرے ذہن پر سوار رہے گا اور میرے افسانوں میں اپنی غلیظ جھاڑو لیے کھڑا رہے گا۔ اب میں سمجھتا ہوں تو کیا چاہتا ہے۔ تو وہ کہانی سننا چاہتا ہے جو ہوئی نہیں، ہو سکتی تھی۔ میں تیرے پاؤں سے شروع کرتا ہوں۔ سُن تو چاہتا ہے کہ کوئی تیرے گندے کھردرے پاؤں دھو ڈالے۔ دھو دھو کے اُن سے غلاظت دُور کرے، ان کی بیایوں پر مرہم لگائے۔ تو چاہتا ہے تیرے گھٹنوں کی اُبھری ہوئی ہڈیاں گوشت میں چھپ جائیں۔ تیری

رانوں میں طاقت اور سختی آ جائے۔ تیرے پیٹ کی مرجھائی سلوٹیں غائب ہو جائیں۔ تیرے اُڑے ہوئے بال غائب ہو جائیں۔ تو چاہتا ہے کوئی تیرے ہونٹوں میں رَس ڈال دے، انھیں گویائی بخش دے۔ تیری آنکھوں میں چمک پیدا کر دے۔ تیرے گالوں میں لہو بھر دے۔ تیری چندیا کو گھنے بالوں کی زُلفیں عطا کر دے۔ تجھے اِک مصفا لباس دے دے۔ تیرے اِرد گرد اِک چھوٹی سی چار دیواری کھڑی کر دے۔ حسین، مصفا، پاکیزہ۔ اس میں تیری بیوی راج کرے۔ تیرے بچے قہقہے لگاتے پھریں۔ جو کچھ تو چاہتا ہے وہ میں نہیں کر سکتا۔ میں تیرے ٹوٹے پھوٹے دانتوں کی روتی ہوئی ہنسی پہچانتا ہوں۔ جب تو گائے سے اپنا سر چٹواتا ہے۔ مجھے معلوم ہے تو اپنے تخیل میں اپنی بیوی کو دیکھتا ہے جو تیرے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیر کر تیرا سر سہلا رہی ہے۔ حتیٰ کہ تیری آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔ تیرا سر جھک جاتا ہے اور تو اس کی مہربان آغوش میں سو جاتا ہے اور جب تو آہستہ آہستہ آگ پر میرے لیے مکی کا بھٹا سینکتا ہے اور مجھے محبت اور شفقت سے وہ بھٹا کھلاتا ہے، تو اپنے ذہن کی بینائی میں اس ننھے بچے کو دیکھ رہا ہوتا ہے جو تیرا بیٹا نہیں ہے۔ جو تیری زندگی میں کبھی نہیں آئے گا لیکن جس سے تو نے اِک شفیق باپ کی طرح پیار کیا ہے۔ تو نے اسے گود کھلایا ہے۔ اس کا منہ چوما ہے۔ اسے اپنے کندھے پر بٹھا کر سارے جہان میں گھمایا ہے۔ دیکھو لو یہ ہے میرا بیٹا اور جب یہ سب کچھ تجھے نہیں ملا تو تو سب سے الگ ہو کر کھڑا ہو گیا اور حیرت سے اپنا سر کھجانے لگا اور تیری انگلیاں لاشعوری انداز میں گننے لگیں...... ایک دو تین چار پانچ چھ سات آٹھ۔ آٹھ روپے۔ میں تیری وہ کہانی جانتا ہوں جو ہو سکتی تھی لیکن ہو نہ سکی کیوں کہ میں افسانہ نگار ہوں۔ میں اِک نئی کہانی گھڑ سکتا ہوں۔ اِک نیا انسان نہیں گھڑ سکتا۔ اس کے لیے میں اکیلا کافی نہیں ہوں۔ اس کے لیے افسانہ نگار اور اس کا پڑھنے والا اور ڈاکٹر اور کمپاؤنڈر اور بختیار اور گاؤں کے پٹواری اور نمبردار اور بنیے اور دوکاندار اور حاکم اور سیاست دان اور مزدور اور کھیتوں میں کام کرنے والے کسان ہر شخص کی لاکھوں، کروڑوں اربوں آدمیوں کی اکٹھی مدد چاہیے۔ میں اکیلا مجبور ہوں کچھ نہیں کر سکوں گا۔ جب تک ہم سب مل کے ایک دوسرے کی مدد نہ کریں گے، یہ کام نہ ہو گا اور تو اسی طرح اپنی جھاڑو لیے میرے ذہن کے دروازے پر کھڑا رہے گا اور میں کوئی عظیم افسانہ نہ لکھ سکوں گا۔ جس میں انسانی روح کی مکمل مسرّت جھلک اُٹھے اور کوئی معمار عظیم عمارت نہ تعمیر کر سکے گا، جس میں ہماری قوم کی عظمت اپنی سربلندیاں چھو لے اور کوئی ایسا گیت نہ گا سکے گا جس کی پہنائیوں میں کائنات کی آفاقیت چھلک چھلک جائے۔ یہ بھرپور زندگی ممکن نہیں جب تک

توجھاڑو لیے یہاں کھڑا ہے!

اچھا ہے کھڑا رہ۔ پھر شاید وہ دن کبھی آ جائے کہ کوئی تجھ سے تیری جھاڑو چھڑا لے اور تیرے ہاتھوں کو نرمی سے تھام کر تجھے قوسِ قزح کے اُس پار لے جائے!

◆◆◆

مہالکشمی کا پُل

مہالکشمی اسٹیشن کے اُس پار مہالکشمی جی کا ایک مندر ہے۔ اُسے لوگ ریس کورس بھی کہتے تھے۔ اس مندر میں پوجا کرنے والے لوگ ہارتے زیادہ ہیں جیتتے بہت کم ہیں۔ مہالکشمی اسٹیشن کے اُس پار ایک بڑی بدرو ہے جو انسانی جسموں کی غلاظت کو اپنے متعفن پانیوں میں گھولتی ہوئی شہر سے باہر چلی جاتی ہے۔ مندر میں انسان کے دل کی غلاظت دُھلتی ہے اور بدرو میں انسان کے جسم کی غلاظت۔ دونوں کے بیچ میں مہالکشمی کا پُل ہے۔ مہالکشمی کے پُل کے اُوپر بائیں طرف لوہے کے جنگلے پر چھ ساڑیاں لہرا رہی ہیں۔ پُل کے اُس طرف ہمیشہ اس مقام پر چند ایک ساڑیاں لہراتی رہتی ہیں۔ یہ ساڑیاں بہت قیمتی نہیں ہیں۔ یہ لوگ ہر روز ان ساڑیوں کو دھو کر سوکھنے کے لیے ڈال دیتے ہیں اور ریلوے لائن کے آر پار جاتے ہوئے لوگ، مہالکشمی اسٹیشن پر گاڑی کا انتظار کرتے ہوئے لوگ، اس گاڑی کی کھڑکی اور دروازوں سے جھانک کر باہر دیکھنے والے لوگ، اکثر ان ساڑیوں کو ہوا میں جھولتا ہوا دیکھتے ہیں۔ وہ ان کے مختلف رنگ دیکھتے ہیں۔ بھورا، مٹ میلا، نیلا، قرمزی، گندا سُرخ، کنارا گہرا نیلا اور لال۔ وہ لوگ اکثر ان رنگوں کو فضا میں پھیلے ہوئے دیکھتے ہیں ایک لمحے کے لیے۔ دوسرے لمحے میں گاڑی پُل کے نیچے سے گزر جاتی ہے۔

ان ساڑیوں کے رنگ اب جاذبِ نظر نہیں رہے۔ کسی زمانے میں ممکن ہے جب یہ نئی نئی خریدی گئی ہوں، اُن کے رنگ خوبصورت اور چمکتے ہوئے ہوں مگر اب نہیں ہیں۔ متواتر دھوئے جانے سے ان کے رنگوں کی آب و تاب مر چکی ہے اور اب یہ ساڑیاں اپنے پھیکے سیٹھے روزمرہ کے انداز کو لیے بڑی بے دلی سے جنگلے پر پڑی نظر آتی ہیں۔ آپ دن میں انھیں سو بار دیکھیے، یہ کبھی

آپ کو خوبصورت دکھائی نہ دیں گی۔ نہ اُن کا رنگ وروپ اچھا ہے نہ اُن کا کپڑا۔ یہ بڑی سستی گھٹیا قسم کی ساڑیاں ہیں۔ ہر روز دھلنے سے ان کا کپڑا ابھی تار تار ہو رہا ہے۔ ان میں کہیں کہیں روزن بھی نظر آتے ہیں۔ کہیں اُدھڑے ہوئے ٹانکے ہیں، کہیں بدنما چتلے داغ، جو اس قدر پائیدار ہیں کہ دھوئے جانے سے بھی نہیں دھلتے بلکہ اور گہرے ہوتے چلے جاتے ہیں۔ میں ان ساڑیوں کی زندگیوں کو جانتا ہوں کیونکہ ان لوگوں کو جانتا ہوں جو ان ساڑیوں کو استعمال کرتے ہیں۔ یہ لوگ مہالکشمی پُل کے قریب ہی بائیں طرف آٹھ نمبر کی چال میں رہتے ہیں۔ یہ چال متوالی نہیں ہے، بڑی غریب سی چال ہے۔ میں بھی اس چال میں رہتا ہوں اس لیے آپ کو ان ساڑیوں اور ان کے پہننے والوں کے متعلق سب کچھ بتا سکتا ہوں۔ ابھی وزیر اعظم کی گاڑی آنے میں بہت دیر ہے۔ آپ انتظار کرتے کرتے اُکتا جائیں گے اس لیے اگر آپ ان چھ ساڑیوں کی زندگی کے بارے میں مجھ سے کچھ سُن لیں تو وقت آسانی سے کٹ جائے گا۔ ادھر یہ جو بھورے رنگ کی ساڑی لٹک رہی ہے، یہ شانتا بائی کی ساڑی ہے۔ اس کے قریب جو ساڑی لٹک رہی ہے وہ بھی آپ کو بھورے رنگ کی دکھائی دیتی ہوگی مگر وہ تو گہرے بھورے رنگ کی ہے۔ آپ نہیں میں، اس کا گہرا بھورا رنگ دیکھ سکتا ہوں کیونکہ میں اسے اُس وقت سے جانتا ہوں جب اس کا رنگ چمکتا ہوا گہرا بھورا تھا۔ اب اس دوسری ساڑی کا رنگ بھی ویسا ہی بھورا ہے جیسا شانتا بائی کی ساڑی کا اور شاید آپ ان دونوں ساڑیوں میں بڑی مشکل سے فرق محسوس کر سکیں۔ میں جب بھی ان کے پہننے والوں کی زندگیوں کو دیکھتا ہوں تو بہت کم فرق محسوس کرتا ہوں۔ مگر یہ پہلی ساڑی جو بھورے رنگ کی ہے، وہ شانتا بائی کی ساڑی ہے اور جو دوسری بھورے رنگ کی ساڑی ہے جس کا گہرا بھورا رنگ صرف میری آنکھیں دیکھ سکتی ہیں، وہ جیونا بائی کی ساڑی ہے۔

شانتا بائی کی زندگی بھی اس ساڑی کے رنگ کی طرح بھوری ہے۔ شانتا بائی برتن مانجھنے کا کام کرتی ہے۔ اس کے تین بچے ہیں۔ ایک بڑی لڑکی ہے۔ دو چھوٹے لڑکے۔ بڑی لڑکی کی عمر چھ سال کی ہوگی۔ سب سے چھوٹا لڑکا دو سال کا ہے۔ شانتا بائی کا خاوند سیون مل میں کپڑے کھاتے میں کام کرتا ہے، اُسے بہت جلد جانا ہوتا ہے اس لیے شانتا بائی اپنے خاوند کے لیے دوسرے دن کی دوپہر کا کھانا رات ہی کو پکا رکھتی ہے کیونکہ صبح اسے خود برتن صاف کرنے کے لیے اور پانی ڈھونے کے لیے دوسرے گھروں میں جانا ہوتا ہے۔ اب وہ ساتھ میں اپنی چھ سال کی بچی کو بھی لے جاتی ہے اور دوپہر کو چال میں واپس آتی ہے۔ واپس آ کے وہ نہاتی ہے، اپنی ساڑی

دھوتی ہے اور سکھانے کے لیے پُل کے جنگلے پر ڈال دیتی ہے اور پھر ایک بیحد غلیظ اور پرانی دھوتی پہن کر کھانا پکانے لگ جاتی ہے۔ شانتا بائی کے گھر چولہا اسی وقت سُلگ سکتا ہے جب دوسروں کے ہاں چولہے ٹھنڈے ہو جائیں۔ یعنی دوپہر کو دو بجے اور رات کو نو بجے۔ ان اوقات کے اِدھر اور اُدھر اُسے دونوں وقت گھر کے باہر برتن مانجھنے اور پانی ڈھونے کا کام کرنا ہوتا ہے۔ اب تو اس کی چھوٹی لڑکی بھی اُس کا ہاتھ بٹاتی ہے۔ شانتا بائی برتن صاف کرتی ہے، چھوٹی لڑکی برتن دھوتی جاتی ہے۔ دو تین بار ایسا ہوا کہ چھوٹی لڑکی کے ہاتھ سے چینی کے برتن گر کر ٹوٹ گئے۔ اب میں جب کبھی چھوٹی لڑکی کی آنکھیں سوجی ہوئی اور اُس کے گال سُرخ دیکھتا ہوں تو سمجھ جاتا ہوں کہ کسی بڑے گھر میں چینی کے برتن ٹوٹے ہیں۔ اُس دن شانتا بھی میرے نمستے کا جواب نہیں دیتی۔ جلتی بھنتی بڑبڑاتی چولہا سلگانے میں مصروف ہو جاتی ہے اور چولہے میں آگ کم اور دھواں زیادہ نکالنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ چھوٹا لڑکا جو دو سال کا ہے، دھوئیں سے اپنا دم گھٹتا دیکھ کر چیختا ہے۔ تو شانتا بائی اُس کی چینی ایسے رخساروں پر زور زور سے چپتیں لگانے سے باز نہیں آتی۔ اس پر بچہ اور زیادہ چیختا ہے۔ یوں تو یہ دن بھر روتا رہتا ہے کیونکہ اسے دودھ نہیں ملتا۔ اُسے اکثر بھوک لگی رہتی ہے اور دو سال کی عمر میں ہی اسے باجرے کی روٹی کھانی پڑتی ہے۔ اُسے اپنی ماں کا دودھ اپنے دوسرے بھائی بہن کی طرح صرف پہلے چھ مہینے ہی نصیب ہوا، بڑی مشکل سے۔ پھر یہ بھی خشک باجری اور ٹھنڈے پانی پر پلنے لگا۔ ہماری چال کے سارے بچے اسی خوراک پر پلتے ہیں۔ وہ دن بھر ننگے رہتے ہیں اور رات کو گدڑی اوڑھ کر سو جاتے ہیں۔ سوتے میں بھی وہ بھوکے رہتے ہیں اور جب شانتا بائی کے خاوند کی طرح بڑے ہو جاتے ہیں تو دن بھر خشک باجری اور ٹھنڈا پانی پی پی کر کام کرنے جاتے ہیں۔ اُن کی بھوک بڑھتی جاتی ہے اور وہ ہر وقت معدہ کے اندر اور دل کے اندر اور دماغ کے اندر ایک بوجھل سی دھمک محسوس کرتے رہتے ہیں، جب پگار ملتی ہے تو ان میں سے کئی ایک سیدھے تاڑی خانے کی طرف رُخ کرتے ہیں۔ تاڑی پی کر چند گھنٹوں کے لیے یہ دھمک زائل ہو جاتی ہے لیکن آدمی ہمیشہ تو تاڑی پی نہیں سکتا۔ ایک دن پئے گا دو دن پئے گا۔ تیسرے دن تاڑی کے لیے پیسے کہاں سے لائے گا؟ آخر کھولی کا کرایہ دینا ہے، راشن کا خرچہ ہے، بھاجی ترکاری ہے، تیل اور نمک ہے، بجلی اور پانی ہے۔ شانتا بائی کی بھوری ساڑی ہے جو چھٹے ساتویں ماہ تار تار ہو جاتی ہے۔ کبھی سات ماہ سے زیادہ نہیں چلتی۔ یہ مل والے بھی پانچ روپے چار آنے میں کیسی کھردری نکمی ساڑی دیتے ہیں، اس کے کپڑے میں ذرا جان نہیں ہوتی۔ چھٹے

ماہ سے جو تار تار ہونا شروع ہوتا ہے تو ساتویں ماہ بڑی مشکل سے ہی کے، جوڑ کے، گانٹھ کے، ٹانکے لگا کر کام دیتا ہے اور پھر وہی پانچ روپے چار آنے خرچ کرنے پڑتے ہیں۔ اور وہی بھورے رنگ کی ساڑی آجاتی ہے۔ شانتا بائی کو یہ رنگ بہت پسند ہے اس لیے کہ یہ میلا بہت دیر میں ہوتا ہے۔ اُسے گھروں میں جھاڑو دینا ہوتی ہے، برتن صاف کرنے ہوتے ہیں، تیسری چوتھی منزل تک پانی ڈھونا پڑتا ہے۔ وہ بھورا رنگ نہیں پسند کرے گی تو کیا کھلتے ہوئے شوخ رنگ، گلابی، بسنتی، نارنجی پسند کرے گی؟ وہ اتنی بیوقوف نہیں ہے۔ دو تین بچوں کی ماں ہے لیکن کبھی اُس نے یہ شوخ رنگ بھی دیکھے تھے، پہنے تھے، انھیں اپنے دھڑکتے ہوئے دل سے پیار کیا تھا۔ جب وہ دھارواڑ میں اپنے گاؤں میں تھی، جہاں اُس نے بادلوں میں شوخ رنگوں والی دھنک دیکھی تھی، جہاں میلوں میں اُس نے شوخ رنگ ناچتے ہوئے دیکھے تھے، جہاں اس کے باپ کے دھان کے کھیت تھے، ایسے شوخ، ہرے ہرے رنگ کے کھیت اور آنگن میں پیرو کا پیڑ، جس کی ڈال ڈال سے وہ پیرو توڑ کے کھایا کرتی تھی۔ جانے اب پیروؤں میں وہ مزا ہی نہیں ہے۔ وہ شیرینی اور گھلاوٹ ہی نہیں ہے۔ وہ رنگ، وہ چمک، وہ دمک کہاں جا کے مرگئی۔ وہ سارے کیوں یک لخت بھورے ہو گئے؟ شانتا بائی کبھی برتن مانجھتے مانجھتے، کھانا پکاتے، اپنی ساڑی دھوتے، اُسے پُل کے جنگلے پر لا کر ڈالتے ہوئے یہ سوچا کرتی ہے۔ اُس کی بھوری ساڑی سے پانی کے قطرے آنسوؤں کی طرح ریل کی پٹری پر بہتے چلے جاتے ہیں اور دوسرے دیکھنے والے لوگ ایک بھورے رنگ کی بدصورت عورت کو پُل کے اُوپر جنگلے پر ایک بھوری ساڑی پھیلاتے ہوئے دیکھتے ہیں اور بس۔ دوسرے لمحے میں گاڑی پُل کے نیچے سے گزر جاتی ہے۔

جیونا بائی کی ساڑی، جو شانتا بائی کی ساڑی کے ساتھ لٹک رہی ہے، گہرے بھورے رنگ کی ہے۔ بظاہر اس کا رنگ شانتا بائی کی ساڑی سے بھی پھیکا نظر آئے گا لیکن اگر آپ اسے غور سے دیکھیں گے تو اس پھیکے پن کے باوجود یہ آپ کو گہرے بھورے رنگ کی نظر آئے گی۔ یہ بھی ساڑی پانچ روپے چار آنے کی ہے اور بڑی بوسیدہ ہے۔ وہ ایک جگہ سے پھٹی ہوئی تھی لیکن اب وہاں پر ٹانکے لگ گئے ہیں اور اتنی دُور سے معلوم بھی ہوتے ہیں۔ ہاں آپ وہ بڑا ٹکڑا ضرور دیکھ سکتے ہیں جو گہرے نیلے رنگ کا ہے اور اس ساڑی کے بیچ میں، جہاں سے یہ ساڑی پھٹ چکی تھی، لگایا گیا ہے۔ یہ ٹکڑا جیونا بائی کی پہلی ساڑی کا ہے اور دوسری ساڑی کو مضبوط بنانے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ جیونا بائی بیوہ ہے، اس لیے وہ ہمیشہ پرانی چیزوں سے نئی چیزوں کو مضبوط بنانے کے ڈھنگ

سوچا کرتی ہے۔ پرانی یادوں سے نئی یادوں کی تلخیوں کو بھول جانے کی کوشش کیا کرتی ہے۔ جیونا بائی اپنے خاوند کے لیے روتی رہتی ہے جس نے ایک دن نشے میں مار مار کر اُس کی ایک آنکھ کانی کر ڈالی تھی۔ وہ اس لیے نشے میں تھا کہ وہ اُس روز مل سے نکالا گیا تھا۔ بڈھا ڈھونڈو اب مل میں کسی کام کا نہیں رہا تھا۔ گو وہ بہت تجربہ کار تھا لیکن اُس کے ہاتھوں میں اتنی طاقت نہ رہی تھی کہ جوان جوان مزدوروں کا مقابلہ کر سکتا بلکہ وہ تو اب دن رات کھانسی میں مبتلا رہنے لگا تھا۔ کپاس کے ننھے ریشے اس کے پھیپھڑوں میں جا کے ایسے دھنس گئے تھے جیسے چرخیوں اور انٹیوں میں سوت کے چھوٹے چھوٹے مہین تاگے پھنس جاتے ہیں۔ جب برسات آتی تو یہ ننھے ننھے ریشے اُسے دمے میں مبتلا کر دیتے اور جب برسات نہ ہوتی تو وہ دن بھر اور رات بھر کھانستا۔ ایک خشک اور مسلسل کھنکھار گھر میں اور کارخانے میں، جہاں وہ کام کرتا تھا، سُنائی دیتی رہتی۔ مل کے مالک نے اسی کھانسی کی خطرناک گھنٹی کو سُنا اور ڈھونڈو کو مل سے نکال دیا۔ ڈھونڈو اس کے چھ ماہ بعد مر گیا۔ جیونا بائی کو اس کے مرنے کا بہت غم ہوا۔ کیا ہوا؟ اگر غصے میں آ کے ایک دن اُس نے جیونا بائی کی آنکھ کھودی تھی! تیس سال کی شادی شدہ زندگی ایک لمحے کے غصے پر قربان نہیں کی جا سکتی اور اُس کا غصہ بجا تھا۔ اگر مل مالک ڈھونڈھو کو یوں بے قصور نوکری سے الگ نہ کرتا تو کیا جیونا بائی کی آنکھ نکل سکتی تھی؟ ڈھونڈو ایسا نہ تھا۔ اُسے اپنی بیکاری کا غم تھا۔ اپنی ۳۵ سالہ ملازمت سے برطرف ہونے کا غم تھا اور سب سے بڑا رنج اس بات کا تھا کہ مل مالک نے چلتے وقت اُسے ایک دھیلا بھی تو نہیں دیا۔ پینتیس سال پہلے جیسے ڈھونڈو خالی ہاتھ مل میں کام کرنے کے لیے آیا تھا اسی طرح خالی ہاتھ واپس لوٹا اور دروازے سے باہر نکلنے پر اور اپنا نمبری کارڈ پیچھے چھوڑ آنے پر اُسے ایک دھچکا سا لگا۔ باہر آ کے اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے ان ۳۵ سالوں میں کسی نے اُس کا سارا رنگ، سارا خون، اُس کا سارا رس چوس لیا تھا اور اُسے بیکار سمجھ کر باہر کے کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر پھینک دیا ہو۔ ڈھونڈو بڑی حیرت سے مل کے دروازے کو اور اُس بڑی چمنی کو دیکھنے لگا جو بالکل اُس کے سر پر ایک خوفناک دیو کی طرح آسمان سے لگی کھڑی تھی۔ یکا یک ڈھونڈو نے غم اور غصے سے اپنے ہاتھ ملے، زمین پر زور سے تھوکا اور پھر تاڑی خانے چلا گیا۔

لیکن جیونا بائی کی ایک آنکھ جب بھی نہ جاتی، اگر اُس کے پاس علاج کے لیے پیسے ہوتے۔ وہ آنکھ تو گل گل کر، سڑ سڑ کر خیراتی اسپتالوں میں ڈاکٹروں۔ کمپاؤنڈروں اور نرسوں کی بداحتیاطی اور گالیوں اور لاپروائیوں کا شکار ہو گئی۔ جب جیونا بائی اچھی ہو گئی تو ڈھونڈو بیمار پڑ گیا

اور ایسا بیمار پڑا کہ پھر بستر سے نہ اُٹھ سکا۔ اُن دنوں میں جیونا بائی اُس کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ شانتا بائی نے مدد کے طور پر اُسے چند گھروں میں برتن مانجھنے کا کام دلوا دیا تھا۔ گو وہ بوڑھی تھی اور مشاقی اور صفائی سے برتنوں کو صاف نہ رکھ سکتی تھی، پھر بھی وہ آہستہ آہستہ رینگ رینگ کر اپنے کمزور ہاتھوں میں جھوٹی طاقت کے بودے سہارے پر جیسے تیسے کام کرتی رہی۔ خوبصورت لباس پہننے والی، خوشبودار تیل لگانے والی بیویوں کی گالیاں سنتی رہی اور کام کرتی رہی کیونکہ اُس کا ڈھونڈو بیمار تھا اور اُسے اپنے آپ کو اور اپنے خاوند کو زندہ رکھنا تھا۔ لیکن ڈھونڈو زندہ نہ رہا اور اب جیونا بائی اکیلی تھی۔ خیریت اس میں تھی کہ بالکل اکیلی تھی اور اب اُسے صرف اپنا دھندہ کرنا تھا۔ شادی کے دو سال بعد اُس کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی لیکن جب وہ جوان ہوئی تو کسی بدمعاش کے ساتھ بھاگ گئی اور اُس کا آج تک کسی کو پتہ نہ چلا کہ وہ کہاں ہے۔ پھر کسی نے بتایا اور پھر بعد میں بہت سے لوگوں نے بتایا کہ جیونا بائی کی بیٹی فارس روڈ پر چمکیلا بھڑکیلا لباس پہنے بیٹھتی ہے لیکن جیونا بائی کو یقین نہیں آیا۔ اُس نے اپنی ساری زندگی پانچ روپے چار آنے کی دھوتی پہنے بسر کر دی تھی اور اُسے یقین تھا کہ اُس کی لڑکی کبھی ایسا نہیں کرے گی۔ اس کا اُسے خیال بھی نہ آیا تھا۔ وہ کبھی فارس روڈ نہیں گئی تھی کیونکہ اُسے یقین تھا کہ اُس کی بیٹی وہاں نہیں ہے۔ بھلا اُس کی بیٹی وہاں کیوں جانے لگی، یہاں اپنی کھولی میں کیا نہ تھا؟ پانچ روپے چار آنے والی دھوتی تھی، باجرے کی روٹی تھی، ٹھنڈا پانی تھا، سوکھی عزت تھی اور یہ سب کچھ چھوڑ کے وہ فارس روڈ کیوں جانے لگی؟ اُسے تو کوئی بدمعاش اپنی محبت کے سبز باغ دکھا کے لے گیا تھا کیونکہ عورت محبت کے لیے سب کچھ کر گزرتی ہے۔ خود وہ تیس سال پہلے اپنے ڈھونڈو کے لیے اپنے ماں باپ کا گھر چھوڑ کر نہیں چلی آئی تھی؟ جس دن ڈھونڈو مرا اور جب لوگ اس کی لاش کو جلانے لگے اور جیونا بائی نے اپنی سیندور کی ڈبیا اپنی بیٹی کی انگیا پر انڈیل دی جو اُس نے بڑی مدت سے ڈھونڈو کی نظروں سے چھپا کر رکھی تھی۔ عین اُسی وقت ایک گدرائے ہوئے جسم کی بھاری عورت بڑا چمکیلا لباس پہنے اُس سے آ کے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور اُسے دیکھ کر جیونا بائی کو یقین آ گیا کہ جیسے اب سب کچھ مر گیا ہے۔ اُس کا پتی، اُس کی بیٹی، اُس کی عزت، جیسے وہ زندگی بھر روٹی نہیں غلاظت کھاتی رہی ہے۔ جیسے اُس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ اُسے نہتا، ننگا اور بے عزت کر دیا گیا تھا۔ جیونا بائی کو اس ایک لمحے میں احساس ہوا کہ وہ جگہ جہاں اُس کا خاوند زندگی بھر کام کرتا رہا اور وہ جگہ جہاں اُس کی آنکھ اندھی ہو گئی اور وہ جگہ جہاں اُس کی بیٹی اپنی دوکان سجا کر بیٹھ گئی، ایک بہت بڑا اندھا کارخانہ

ہے، جس میں کوئی ظالم، جابر ہاتھ انسانی جسموں کو گنے کا رس نکالنے والی مشین میں ٹھونستا جاتا ہے اور دوسرے ہاتھ سے توڑ مروڑ کر دوسری طرف پھینکتا جاتا ہے۔ یکایک جیونا بائی اپنی بیٹی کو دھکا دے کر الگ کھڑی ہوگئی اور چیخیں مار مار کر رونے لگی۔

تیسری ساڑی کا رنگ مٹ میلا نیلا ہے یعنی نیلا بھی ہے اور میلا بھی ...... اور مٹیالا بھی ہے۔ اور کچھ عجیب سا رنگ ہے جو بار بار دھونے پر بھی نہیں نکھرتا اور غلیظ ہوتا جاتا ہے۔ یہ میری بیوی کی ساڑی ہے۔ میں فورٹ میں دھنو بھائی کی فرم میں کلرکی کرتا ہوں۔ پینسٹھ روپے تنخواہ ملتی ہے۔ سیون مل اور بکسریا مل کے مزدوروں کو بھی یہی تنخواہ ملتی ہے اس لیے میں بھی انہی کے ساتھ آٹھ نمبر کی چال کی ایک کھولی میں رہتا ہوں مگر میں مزدور نہیں ہوں کلرک ہوں۔ میں فورٹ میں نوکر ہوں۔ میں دسویں پاس ہوں۔ ٹائپ کر سکتا ہوں اور انگریزی میں لکھ سکتا ہوں۔ میں اپنے وزیر اعظم کی تقریر جلسے میں سُن کر سمجھ بھی لیتا ہوں۔ آج تھوڑی دیر بعد اُن کی گاڑی مہا لکشمی پر آئے گی۔ نہیں وہ ریس کورس نہیں جائیں گے۔ وہ سمندر کے کنارے ایک شاندار تقریر کریں گے۔ اس موقع پر لاکھوں لوگ جمع ہوں گے۔ ان لاکھوں میں میں بھی ایک ہوں گا۔ میری بیوی کو اپنے وزیر اعظم کی باتیں سُننے کا بہت شوق ہے مگر اُسے اپنے ساتھ لے نہیں جا سکتا کیونکہ ہمارے آٹھ بچے ہیں اور گھر میں ہر وقت پریشانی سی رہتی ہے۔ جب دیکھو کوئی نہ کوئی چیز کم ہو جاتی ہے۔ راشن تو روز کم پڑتا ہے۔ اب نل میں پانی بھی کم آتا ہے۔ رات کو سونے کے لیے جگہ بھی کم پڑتی ہے اور تنخواہ تو اس قدر کم پڑتی ہے کہ مہینے میں صرف پندرہ دن چلتی ہے۔ باقی پندرہ دن سود خور پٹھان چلاتا ہے اور وہ بھی کیسے؟ گالیاں بکتے جھکتے، گھسٹ گھسٹ کر کسی سست رفتار مال گاڑی کی طرح یہ زندگی چلتی ہے۔

میرے آٹھ بچے ہیں مگر یہ اسکول میں نہیں پڑھ سکتے۔ میرے پاس اُن کی فیس کے پیسے کبھی نہ ہوں گے۔ پہلے پہل جب میں نے بیاہ کیا تھا تو ساوتری کو اپنے گھر یعنی کھولی میں لایا تھا تو میں نے سوچا تھا۔ اُن دنوں ساوتری بھی اچھی اچھی باتیں سوچا کرتی تھی۔ گوبھی کے نازک نازک پتوں کی طرح پیاری پیاری باتیں۔ جب وہ مسکراتی تو سنیما کی تصویر کی طرح خوبصورت دکھائی دیا کرتی۔ اب وہ مسکراہٹ نہ جانے کہاں چلی گئی ہے اور اس کی جگہ ایک مستقل تیوری نے لے لی ہے۔ وہ ذرا سی بات پر بچوں کو بے تحاشہ پیٹنا شروع کر دیتی ہے اور میں تو کچھ بھی کہوں، کیسے بھی کہوں، کتنی ہی لجاجت سے کہوں، وہ تو مجھے کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے۔ پتہ نہیں ساوتری کو کیا ہو

ہے؟ پتہ نہیں مجھے کیا ہوگیا ہے؟ میں دفتر میں سیٹھ کی گالیاں سُنتا ہوں، گھر پر بیوی کی گالیاں سُنتا ہوں اور ہمیشہ خاموش رہتا ہوں۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں شاید میری بیوی کو ایک نئی ساڑی کی ضرورت ہے۔ شاید اسے صرف ایک نئی ساڑی ہی نہیں ایک نئے چہرے، ایک نئے گھر، ایک نئے ماحول، ایک نئی زندگی کی ضرورت ہے مگر اب ان باتوں کو سوچنے سے کیا ہوتا ہے؟ اب تو آزادی آ گئی ہے۔ ہمارے وزیر اعظم نے بھی کہہ دیا ہے کہ اس نسل کو یعنی ہم لوگوں کو اپنی زندگی میں کوئی آرام نہیں مل سکتا۔ میں نے ساوتری کو اپنے وزیر اعظم کی تقریر، جو اخبار میں پڑھی تھی، سنائی تو وہ اسے سُن کر آگ بگولہ ہوگئی اور اُس نے غصے میں آکر چولہے کے قریب پڑا ہوا چمٹا میرے سر پر دے مارا۔ یہ زخم کا نشان جو آپ میرے ماتھے پر دیکھ رہے ہیں، اسی کا نشان ہے مگر آپ انھیں نہیں دیکھ سکیں گے۔ میں دیکھ سکتا ہوں۔ ان میں سے ایک نشان تو اُس مونگیا رنگ کی جارجٹ کی ساڑی کا ہے جو اُس نے اوپرا ہاؤس کے نزدیک بھنجی مل بھوندو رام پارچہ فروش کی دوکان پر دیکھی تھی۔ ایک نشان اُس کھلونے کا ہے، جو پچیس روپے کا تھا اور جسے دیکھ کر میرا پہلا بچہ خوشی سے کلکاریاں مارنے لگا تھا لیکن جسے ہم خرید نہیں سکے تھے اور جسے نہ پا کر میرا بچہ دن بھر روتا رہا۔ ایک نشان اُس تار کا ہے جو ایک دن جبلپور سے آیا تھا، جس میں ساوتری کی ماں کی شدید علالت کی خبر تھی۔ ساوتری جبلپور جانا چاہتی تھی لیکن ہزار کوشش کے بعد بھی نہ جا سکی۔ ایک نشان اُس تار کا ہے جس میں اُس کی ماں کی موت کا ذکر تھا۔ ایک نشان .... مگر میں کس کس نشان کا ذکر کروں؟ ان سے چتلے چتلے، گدلے گدلے غلیظ داغ ساوتری کی پانچ روپے چار آنے والی ساڑی میں منتقل ہو جائیں گے۔

چوتھی ساڑی قرمزی رنگ کی ہے اور قرمزی رنگ میں بھورا رنگ بھی جھلک رہا ہے۔ یوں تو یہ سب مختلف رنگوں کی ساڑیاں ہیں لیکن بھورا رنگ ان سب میں جھلکتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ان سب کی زندگی ایک ہے، جیسے ان سب کی قیمت ایک ہے۔ جیسے یہ سب کبھی زمین سے اُوپر نہیں اُٹھیں گی۔ انھوں نے کبھی ہنستی ہوئی دھنک، اُفق پر چمکتی ہوئی شفق، بادلوں میں لہراتی ہوئی برف نہیں دیکھی ہے۔ جیسی شانتا بائی کی جوانی ہے، وہ جیونا بائی کا بڑھاپا ہے اور ساوتری کا ادھیڑ پن ہے۔ جیسے یہ سب ساڑیاں، زندگیاں ایک رنگ، ایک سطح، ایک تواتر، ایک مسلسل یکسانیت لیے ہوئے ہوا میں جھولتی جاتی ہیں۔

یہ قرمزی بھورے رنگ کی ساڑی جھبو بھیئے کی عورت کی ہے۔ اس عورت سے میری بیوی

کبھی بات نہیں کرتی کیونکہ ایک تو اس کے کوئی بچہ وچہ نہیں ہے اور ایسی عورت جس کے کوئی بچہ نہیں ہو، بڑی نحس ہوتی ہے۔ وہ جادو ٹونے کر کے دوسروں کے بچوں کو مار ڈالتی ہے اور بد روحوں کو بلا کے اپنے گھر میں بسا لیتی ہے۔ میری بیوی اسے کبھی منہ نہیں لگاتی۔ یہ عورت جھبو بھیا نے خرید کر حاصل کی ہے۔ جھبو بھیا مراد آباد کا رہنے والا ہے لیکن بچپن ہی سے اپنا دیس چھوڑ کر اِدھر چلا آیا۔ وہ مراٹھی اور گجراتی زبان میں بڑے مزے سے گفتگو کر سکتا ہے۔ اس وجہ سے اسے بہت جلد پورو امل کے گنی کھاتے میں جگہ مل گئی۔ جھبو بھیا کو شروع ہی سے بیاہ کا بہت شوق تھا۔ اُسے بیڑی کا، تاڑی کا، کسی چیز کا شوق نہیں تھا۔ شوق تھا تو صرف اس بات کا کہ اس کی شادی جلد سے جلد ہو جائے۔ جب اُس کے پاس ستر اسی روپے اکٹھا ہو گئے تو اُس نے اپنے دیس جانے کی ٹھانی تا کہ وہ اپنی برادری سے کسی کو بیاہ لائے مگر پھر اُس نے سوچا ان ستر اسی روپیوں میں کیا ہوگا۔ آنے جانے کا کرایہ بھی بڑی مشکل سے پورا ہوگا۔ چار سال کی محنت کے بعد اُس نے یہ رقم جوڑی تھی لیکن اس رقم سے مراد آباد جا سکتا تھا، جا کے شادی نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے جھبو بھیا نے یہیں ایک بدمعاش سے بات چیت کر کے اس عورت کو سو روپے میں خرید لیا۔ اسی روپے اُس نے نقد دیے، بیس روپے اُدھار میں رہے۔ جو اُس نے ایک سال کے عرصے میں ادا کیے۔ بعد میں جھبو کو معلوم ہوا کہ عورت بھی مراد آباد کی رہنے والی تھی، دھیرج گاؤں کی اور اس کی برادری ہی کی تھی۔ جھبو بڑا خوش ہوا چلو یہیں بیٹھے بیٹھے سب کام ہو گیا۔ اپنی ذات برادری کی، اپنے ضلعے کی دھرم کی عورت یہیں بیٹھے بٹھائے سو روپے میں مل گئی۔ اُس نے بڑے چاؤ سے اپنا بیاہ رچایا۔ پھر اُسے معلوم ہوا کہ اس کی بیوی لڑیا بہت اچھا گاتی ہے۔ وہ خود بھی اپنی پاٹ دار آواز میں زور سے گانے بلکہ گانے سے زیادہ چلانے کا شوقین تھا۔ اب تو کھولی میں دن رات گویا کسی نے ریڈیو کھول دیا ہو۔ دن میں کھولی میں لڑیا کام کرتے ہوئے گاتی تھی۔ رات کو جھبو اور لڑیا دونوں گاتے۔ اُن کے ہاں کوئی بچہ نہ تھا اس لیے انھوں نے ایک طوطا پال رکھا تھا۔ لڑیا میں ایک اور بات بھی تھی۔ جھبو نہ بیڑی پیے نہ سگریٹ، نہ تاڑی، لڑیا بیڑی سگریٹ تاڑی بھی کچھ پیتی تھی۔ کہتی تھی پہلے وہ سب کچھ نہیں جانتی تھی مگر جب ایک بدمعاش کے پلے پڑ گئی، اُسے یہ سب باتیں سیکھنا پڑیں اور اب وہ سب باتیں چھوڑ سکتی ہے مگر بیڑی اور تاڑی نہیں چھوڑ سکتی۔ کئی بار تاڑی پی کر لڑیا نے جھبو پر حملہ کیا اور جھبو نے اُسے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔ اس موقعے پر طوطا بڑا شور مچاتا تھا اور رات کو دونوں کو گالیاں بکتے دیکھ کر خود بھی پنجرے میں ٹنگا ہوا زور زور سے چلا کر

وہی گالیاں بکتا جو وہ دونوں بکتے تھے۔ ایک بار تو اُس کی گالی سُن کر جھبو غصے میں آ کر طوطے کو پنجرے سمیت بدرو میں پھینکنے لگا تھا مگر جیونا بائی نے بیچ میں پڑ کر طوطے کو بچا لیا۔ طوطے کو مارنا بڑا پاپ ہے۔ جیونا بائی نے کہا تمھیں برہمنوں کو بُلا کر پرائشچت کرنا پڑے گا اور تمھارے پندرہ بیس روپے کھل جائیں گے۔ یہ سوچ کر جھبو نے طوطے کو بدرو میں غرق کرنے کا خیال ترک کر دیا۔

شروع شروع میں تو جھبو کو ایسی شادی پر چاروں طرف سے گالیاں پڑیں۔ وہ خود بھی لڑیا کو بڑے شبہ کی نظروں سے دیکھتا تھا۔ کئی بار اُسے بلا وجہ پیٹتا اور خود بھی مل سے غیر حاضر رہ کر اُس کی نگرانی کرتا رہا مگر آہستہ آہستہ لڑیا نے اپنا اعتبار ساری چال میں قائم کر لیا۔ لڑیا کہتی تھی کہ کوئی عورت سچے دل سے بدمعاشوں کے پلے پڑنا پسند نہیں کرتی۔ وہ تو ایک گھر چاہتی ہے، چاہے وہ چھوٹا سا ہی ہو۔ وہ ایک خاوند چاہتی ہے جو اس کا اپنا ہو۔ چاہے وہ جھبو بھیا ایسا شور مچانے والا، زبان دراز، شیخی خورا ہی کیوں نہ ہو۔ وہ ایک ننھا بچہ چاہتی ہے، چاہے وہ کتنا ہی بدصورت کیوں نہ ہو اور اب لڑیا کے پاس گھر بھی تھا اور جھبو بھی تھا اور اگر بچہ نہ تھا تو کیا ہوا، ہو جائے گا اور اگر نہیں ہوتا تو بھگوان کی مرضی۔ یہ میاں مٹھو ہی اس کا بیٹا بنے گا۔

ایک روز لڑیا میاں مٹھو کا پنجرہ جھلا رہی اور اُسے چُوری کھلا رہی تھی اور اپنے دن کے سپنوں میں اس ننھے سے بالک کو دیکھ رہی تھی جو فضا میں ہمکتا ہمکتا اُس کی آغوش کی طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا کہ چال میں شور سا بڑھنے لگا اور اُس نے دروازے سے جھانک کر دیکھا کہ چند مزدور جھبو کو اُٹھائے چلے آ رہے ہیں اور اُس کے کپڑے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ لڑیا کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ بھاگتی بھاگتی نیچے گئی اور اُس نے بڑی درشتی سے اپنے خاوند کو مزدوروں سے چھین کر اپنے کندھے پر اُٹھا لیا اور اپنی کھولی میں لے آئی۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ جھبو سے گنی کھاتے کے منیجر نے کچھ ڈانٹ ڈپٹ کی۔ اس پر جھبو نے اُسے دو ہاتھ جڑ دیے۔ اس پر بہت واویلا ہوا اور منیجر نے اپنے بدمعاشوں کو بُلا کر جھبو کی خوب ٹھکائی کرائی اور اُسے مل سے باہر نکال دیا۔ خیریت ہوئی کہ جھبو بچ گیا ورنہ اُس کے مرنے میں کوئی کسر نہیں تھی۔ لڑیا نے بڑی ہمت سے کام لیا۔ اُس نے اُسی روز سے اپنے سر پر ترکاری اُٹھالی اور گلی گلی ترکاری بیچنے لگی جیسے وہ زندگی میں یہی دھندہ کرتی آئی تھی۔ اس طرح محنت مزدوری کر کے اُس نے اپنے جھبو کو اچھا کر لیا۔ جھبو اب بھلا چنگا ہے مگر اب اُسے کسی مل میں کام نہیں ملتا۔ وہ دن بھر اپنی کھولی میں کھڑا مہالکشمی کے اسٹیشن کے چاروں طرف بلند و بالا کارخانوں کی چمنیوں کو تکتا رہتا ہے۔ سیعون مل، نیو مل، اولڈ مل، پوروا مل، معراج

مل لیکن اُس کے لیے کسی مل میں جگہ نہیں ہے کیونکہ مزدور کو گالی کھانے کا حق ہے گالی دینے کا حق نہیں ہے۔ آج کل لڑیا بازاروں اور گلیوں میں آوازیں لگا لگا کر بھاجی ترکاری فروخت کرتی ہے اور گھر کا سارا کام کاج بھی کرتی ہے۔ اُس نے بیڑی تاڑی سب چھوڑ دی ہے ہاں اُس کی ساڑی ......قرمزی بھورے رنگ کی ساڑی...... جگہ جگہ سے پھٹتی جا رہی ہے۔ تھوڑے دنوں تک اور اگر جھبو کو کام نہ ملا تو لڑیا کو اپنی ساڑی میں پرانی ساڑی کے ٹکڑے جوڑنا پڑیں گے اور میاں مٹھو کو چُوری کھلانا بند کرنا پڑے گا۔

پانچویں ساڑی کا کنارہ گہرا نیلا ہے۔ ساڑی کا رنگ گدلا سُرخ ہے لیکن کنارہ گہرا نیلا ہے۔ اس سارے نیلے میں اب بھی کہیں کہیں چمک باقی ہے۔ یہ ساڑی دوسری ساڑیوں سے بڑھیا ہے کیونکہ یہ ساڑی پانچ روپے چار آنے کی نہیں ہے۔ اس کا کپڑا، اس کی چمک دمک کہے دیتی ہے کہ یہ ذرا اُن سے مختلف ہے۔ آپ کو دُور سے یہ مختلف معلوم نہیں ہوتی ہو گی مگر میں جانتا ہوں کہ یہ ان سے ذرا مختلف ہے۔ اس کا کپڑا بہتر ہے، اس کا کنارہ چمکدار ہے، اس کی قیمت پونے نو روپے ہے۔ یہ ساڑی منجولا کی ہے۔ یہ منجولا کے بیاہ کی ہے۔ منجولا کے بیاہ کو ابھی چھ ماہ بھی نہیں ہوئے ہیں۔ اُس کا خاوند گزشتہ ماہ چرخی کے گھومتے ہوئے پٹے کی لپیٹ میں آ کے مارا گیا تھا۔ اور اب سولہ برس کی خوبصورت منجولا بیوہ ہے۔ اس کا دل جوان ہے، اس کا جسم جوان ہے، اُس کی امنگیں جوان ہیں لیکن اب وہ کچھ نہیں کر سکتی کیونکہ اُس کا خاوند مل کے ایک حادثے میں مر گیا ہے۔ وہ پٹہ بڑا ڈھیلا تھا اور گھومتے ہوئے بار بار پھٹپھٹاتا تھا اور کام کرنے والوں کے احتجاج کے باوجود اسے مل مالکوں نے نہیں بدلا تھا کیونکہ کام چل رہا تھا اور دوسری صورت میں تھوڑی دیر کے لیے کام بند کرنا پڑتا۔ پٹہ کو تبدیل کرنے کے لیے روپیہ بھی خرچ ہوتا ہے۔ مزدور تو کسی وقت بھی تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے روپیہ تھوڑی خرچ ہوتا ہے لیکن پٹہ تو بڑی قیمتی شے ہے۔

جب منجولا کا خاوند مارا گیا تو منجولا نے ہرجانے کی درخواست دی جو نامنظور ہو گئی کیونکہ مل مالکوں کے مطابق منجولا کا شوہر اپنی غلطی سے مرا تھا۔ اس وجہ سے منجولا کو کوئی ہرجانہ نہ ملا اور وہ اپنی وہی نئی دلہن کی ساڑی پہنے رہی جو اُس کے خاوند نے پونے نو روپے میں اس کے لیے خریدی تھی کیونکہ اُس کے پاس کوئی دوسری ساڑی نہیں تھی جو وہ اپنے خاوند کی موت کے سوگ میں پہن سکتی۔ وہ اپنے خاوند کے مر جانے کے بعد بھی دلہن کا لباس پہننے پر مجبور تھی کیونکہ اُس کے پاس کوئی دوسری ساڑی نہ تھی۔ جو ساڑی تھی وہ یہی گدلے سرخ رنگ کی پونے نو روپے کی ساڑی جس کا

کنارہ گہرا نیلا ہے۔

شاید اب منجولا بھی پانچ روپے چار آنے کی ساڑی پہنے گی۔ اُس کا خاوند زندہ رہتا جب بھی وہ دوسری ساڑی پانچ روپے چار آنے کی ہی لاتی۔ اس لحاظ سے اس کی زندگی میں کوئی خاص فرق نہیں آیا مگر اتنا ضرور ہوا ہے کہ وہ یہ ساڑی آج پہننا چاہتی ہے۔ ایک سفید ساڑی پانچ روپے چار آنے والی جسے پہن کر وہ دلہن نہیں، بیوہ معلوم ہو سکے۔ یہ ساڑی دن رات کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے۔ اس ساڑی سے جیسے اس کے مرحوم خاوند کی مضبوط باہیں لپٹی ہیں جیسے اس کے ہر تار پر اس کے شفاف بوسے مرتسم ہیں۔ جیسے اُس کے تانے بانے میں اس کے خاوند کی گرما گرم سانسوں کی حدت آمیز غنودگی ہے۔ اُس کے سیاہ بالوں والی چھاتی کا سارا پیار دفن ہے۔ جیسے یہ ساڑی نہیں ہے ایک گہری قبر ہے جس کی ہولناک پہنائیوں کو وہ ہر وقت اپنے جسم کے گرد لپیٹنے پر مجبور ہے۔ منجولا زندہ قبر میں گاڑی جا رہی ہے۔

چھٹی ساڑھی کا رنگ لال ہے لیکن اسے یہاں نہیں ہونا چاہیے کیونکہ اس کو پہننے والی مر چکی ہے۔ پھر بھی یہ ساڑی یہاں جنگلے پر بدستور موجود ہے۔ روز کی طرح دھلی دھلائی جھول رہی یہ مائی کی ساڑی ہے جو ہماری چال کے دروازے کے قریب اندر کھلے آنگن میں رہا کرتی تھی۔ مائی کا ایک بیٹا تھا سیتو، وہ اب جیل میں ہے۔ سیتو کی بیوی اور اُس کا لڑکا یہیں نیچے آنگن میں دروازے کے قریب دیوار کے نیچے پڑے رہتے ہیں۔ سیتو اور سیتو کی بیوی اور اُس کی لڑکی اور بڑھیا مائی، یہ سب لوگ ہماری چال کے بھنگی ہیں۔ ان کے لیے کھولی بھی نہیں ہے اور ان کو اتنا کھانا کپڑا بھی نہیں ملتا، جتنا ہم لوگوں کو ملتا ہے۔ اس لیے یہ لوگ آنگن میں رہتے ہیں، وہیں کھانا پکاتے ہیں وہیں پڑ کے سو رہتے ہیں۔ یہیں بڑھیا مائی ماری گئی تھی۔ وہ بڑا سوراخ جو آپ اس ساڑی میں دیکھ رہے ہیں، پلو کے قریب یہ گولی کا سوراخ ہے۔ یہ کارتوس کی گولی مائی کو بھنگیوں کی ہڑتال کے دنوں میں لگی تھی۔ نہیں۔ وہ اس ہڑتال میں حصہ نہیں لے رہی تھی۔ وہ بے چاری تو بہت بوڑھی تھی، چل پھر نہ سکتی تھی اس ہڑتال میں تو اس کا بیٹا سیتو اور دوسرے بھنگی شامل تھے۔ یہ لوگ مہنگائی بھتہ مانگتے تھے اور کھولی کا کرایہ مانگتے تھے۔ یعنی اپنی زندگی کے لیے دو وقت کا روٹی کپڑا اور سر پر ایک چھت چاہتے تھے۔ اس لیے ان لوگوں نے ہڑتال کی تھی اور جب ہڑتال خلاف قانون قرار دے دی گئی تو ان لوگوں نے جلوس نکالا۔ جلوس میں مائی کا بیٹا سیتو آگے آگے تھا اور خوب زور شور سے نعرے لگا تا تھا اور پھر جب جلوس خلاف قانون قرار دیا گیا تو گولی چلی اور ہماری چال کے سامنے چلی۔ ہم

لوگوں نے تو اپنے دروازے بند کر لیے لیکن گھبراہٹ میں چال کا دروازہ بند کرنا کسی کو یاد نہ رہا۔ پھر ہمیں اپنے بند کمروں میں ایسا معلوم ہوا گویا گولی اِدھر سے، اُدھر سے چاروں طرف سے چل رہی ہو۔ تھوڑی دیر کے بعد بالکل سناٹا ہو گیا۔ جب ہم لوگوں نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا اور باہر جھانک کر دیکھا تو جلوس تتر بتر ہو چکا تھا اور ہماری چال کے دروازے کے قریب بڑھیا پڑی تھی۔ یہ اُسی بڑھیا کی لال ساڑی ہے جس کا بیٹا سیتو اب جیل میں ہے۔ اس لال ساڑی کو اب بڑھیا کی بہو پہنتی ہے۔ اس ساڑی کو بڑھیا کے ساتھ جلا دینا چاہیے تھا مگر کیا کِیا جائے؟ تن ڈھکنا زیادہ ضروری ہے۔ مُردوں کی عزت اور احترام سے بھی کہیں زیادہ ضروری ہے کہ زندوں کا تن ڈھکا جائے۔ یہ ساڑی جلنے جلانے کے لیے نہیں ہے، تن ڈھکنے کے لیے ہے۔ ہاں کبھی کبھی سیتو کی بیوی اس کے پلو سے اپنے آنسو پونچھ لیتی ہے کیونکہ اس میں پچھلے دس برسوں کے سارے آنسو اور ساری اُمنگیں اور ساری تھکنیں اور شکستیں جذب ہیں۔ آنسو پونچھ کر سیتو کی بیوی پھر اُسی ہمت سے کام کرنے لگتی ہے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ کہیں گولی نہیں چلی، کوئی جیل نہیں گیا۔ بھنگن کی جھاڑو اسی طرح چلنے لگتی۔

اے لو۔ باتوں باتوں میں وزیر اعظم صاحب کی گاڑی نکل گئی۔ وہ یہاں نہیں ٹھہری۔ میں سمجھتا تھا کہ یہاں ضرور ٹھہرے گی۔ وزیر اعظم صاحب درشن دینے کے لیے گاڑی سے نکل کے تھوڑی دیر کے لیے پلیٹ فارم پر ٹہلیں گے اور شاید ہوا میں جھولتی ہوئی ان چھ ساڑیوں کو بھی دیکھ لیں گے، جو مہالکشمی کے پل کے بائیں طرف لٹک رہی ہیں۔...... یہ چھ ساڑیاں جو بہت ہی معمولی عورتوں کی ساڑیاں ہیں، ایسی معمولی معمولی عورتیں جن سے ہمارے دیس کے چھوٹے چھوٹے گھر بنتے ہیں۔ جہاں ایک کونے میں چولہا سلگتا ہے، ایک کونے میں پانی کا گھڑا رکھا ہے۔ اور ہر طاقچے میں شیشہ ہے، کنگھی ہے اور سیندور کی ڈبیہ ہے۔ کھاٹ پر ننھا بچہ سو رہا ہے۔ الگنی پر کپڑے سوکھ رہے ہیں۔ یہ ان چھوٹے چھوٹے لاکھوں کروڑوں گھروں کو بنانے والی عورتوں کی ساڑیاں ہیں، جنھیں ہم ہندوستان کہتے ہیں۔ یہ عورتیں جو ہمارے پیارے پیارے بچوں کی مائیں ہیں، ہمارے بھولے بھائیوں کی عزیز بہنیں ہیں، ہماری معصوم محبتوں کے گیت ہیں، ہماری پانچ ہزار سالہ تہذیب کا سب سے اُونچا نشان ہیں۔ وزیر اعظم صاحب یہ ہوا میں جھولتی ہوئی ساڑیاں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہیں۔ یہ کوئی بڑا ملک، کوئی بڑا عہدہ، کوئی بڑی موٹر کار، کوئی پرمٹ، کوئی ٹھیکہ، کوئی پراپرٹی، یہ ایسی کسی چیز کی تم سے طالب نہیں ہیں۔ یہ تو زندگی کی بہت ہی چھوٹی سی چھوٹی

چیزیں مانگتی ہیں۔ یہ جیونا بائی کی ساڑی ہے جو اپنے بچپن کی کھوئی ہوئی دھنک تم سے مانگتی ہے۔ یہ ساوتری کی ساڑی ہے، جس کے گیت مر چکے ہیں اور جس کے پاس اپنے بچوں کے اسکول کے لیے فیس نہیں۔ یہ لڑیا ہے جس کا خاوند بیکار ہے اور جس کے کمرے میں ایک طوطا ہے جو دو دن سے بھوکا ہے۔ یہ نئی دلہن کی ساڑی ہے جس کے خاوند کی زندگی چمڑے کے پٹے سے بھی کم قیمت ہے۔ یہ بڑی بھنگن کی لال ساڑی ہے جو بندوق کی گولی کو ہل کے پھال میں تبدیل کرنا چاہتی ہے تاکہ دھرتی سے انسان کا لہو پھول بن کر کھل اُٹھے اور کندن کے سنہرے خوشے ہنس کر لہرانے لگیں۔

لیکن وزیر اعظم کی گاڑی نہیں رُکی اور وہ ان چھ ساڑیوں کو نہیں دیکھ سکے اور تقریر کرنے چوپاٹی چلے گئے۔ اس لیے اب میں آپ سے کہتا ہوں کہ اگر کبھی آپ کی گاڑی اِدھر سے گزرے تو آپ ان چھ ساڑیوں کو ضرور دیکھیے جو مہالکشمی کے پُل کے بائیں طرف لٹک رہی ہیں اور پھر آپ ان رنگا رنگ ریشمی ساڑیوں کو بھی دیکھیے جنھیں دھوبیوں نے اس پُل کے دائیں طرف سوکھنے کے لیے لٹکا دیا ہے اور جو اُن گھروں سے آئی ہیں جہاں اُونچی اُونچی چمنیوں والے کارخانوں کے مالک یا اُونچی اُونچی تنخواہیں پانے والے رہتے ہیں۔ آپ اس پُل کے دائیں بائیں دونوں طرف دیکھیے اور پھر اپنے آپ سے پوچھیے کہ آپ کس طرف جانا چاہتے ہیں۔ دیکھیے میں آپ سے اشتراکی بننے کے لیے نہیں کہہ رہا ہوں۔ میں آپ کو جماعتی جنگ کی تلقین بھی نہیں کر رہا ہوں۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ مہالکشمی کے پُل کے دائیں طرف ہیں یا بائیں طرف؟

(مجموعہ نئے غلام، مطبوعہ اپریل ۱۹۵۳ء بمبئی)

◆◆◆

افسانہ نگار کرشن چندر

کرشن چندر (۲۳ر نومبر ۱۹۱۴ء بھرت پور۔ ۸ر مارچ ۱۹۷۷ء بمبئی) کا شمار اُردو کے اہم ترین افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے سینکڑوں افسانے اور درجنوں ناولوں کی تخلیق کی جن میں سے اکثر کا ترجمہ ہندوستانی زبانوں کے علاوہ غیر ملکی زبانوں چینی، جرمن، انگریزی، ترکی، اور چیک وغیرہ میں بھی ہو چکا ہے۔ زندگی میں جتنی شہرت انھیں ملی اتنی شاید ہمارے دَور کے کسی اور کہانی کار کو نہیں ملی مگر مقامِ افسوس کہ اُن کی وفات کے بعد کچھ ادبی حلقوں میں انھیں نظر انداز کیے جانا کے رجحانات پیدا ہو گئے اور منٹو اور بیدی پر جہاں بے شمار سمینار ہوئے، اس کے مقابلے میں کرشن چندر پر بہت ہی کم سمینار وغیرہ کا اہتمام ہوا اور ان پر مضامین بھی بہت کم رسائل میں نظر آئے حالانکہ بحیثیت افسانہ نگار وہ ان حضرات سے کسی طرح کم نہیں تھے اور وہی تھے جنھوں نے تیسرے دہے میں افسانے کو نئے موڑ سے متعارف کرانے میں نمایاں رول ادا کیا اور ان کی شاہکار کہانیوں کی بدولت ہی انھیں ان کی زندگی میں ہی ''ایشیا کا سب سے بڑا افسانہ نگار'' شمار کیا جانے لگا تھا۔ بعد ازاں وہ بے توجہی کا شکار کیوں ہوئے اس کی وجہ نقاد حضرات بہتر جانتے ہوں گے؟ حالانکہ اُن کی زندگی میں ہر بڑا نقاد اور ادیب اُن کی ادبی حیثیت اور اُن کے طرزِ تحریر کا دیوانہ تھا اور سب نے اپنی تحریروں میں ان کی عظمت کا اعتراف کیا تھا۔ چاہے وہ مولانا صلاح الدین احمد ہوں یا میاں بشیر احمد، احتشام حسین ہوں یا محمد حسن عسکری، گیان چند جین ہوں یا گوپی چند نارنگ۔

اُس دور کے نامور نقاد عزیز احمد نے تو کرشن چندر کی کتاب ''پرانے خدا'' کے دیباچہ میں اُن کی عظمت واسلوب کی بھرپور تعریف وتوصیف کی تھی جس سے کرشن چندر کی قد آور شخصیت کا

اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"جہاں تک طرزِ تحریر کا تعلق ہے، اُردو کا کوئی افسانہ نگار کرشن چندر کی گرد کو نہیں پہنچتا۔ درد ہو یا طنز، رومانیت ہو یا حقیقت نگاری اُن کا قلم ہر موقع پر ایسی دل کش چال چلتا ہے جو بانکی بھی ہوتی ہے اور انوکھی بھی لیکن جو اس قدر سادہ اور فطری ہوتی ہے کہ جیسے صبح کے وقت چڑیوں کی پرواز۔ تصنع کا بعید ترین شائبہ بھی کہیں نہیں پایا جاتا، جو نفسِ مضمون ہوتا ہے اس کی اندرونی موسیقی سے ہم آہنگ ہو کے اُن کا قلم لکھتا ہے۔"

بلاشبہ کرشن چندر اُردو کے اُن افسانہ نگاروں میں سے ہیں جن کو نوجوانی میں ہی شہرت و مقبولت حاصل ہوگئی اور جن کی تخلیقات نے ادبی حلقوں میں اُن کی دھاک جمادی۔ انھوں نے اپنی تخلیقات میں ہماری زندگی کے سماجی، سیاسی، معاشی، اخلاقی اور نفسیاتی پہلوؤں کو اس خوبصورت اور دلکش انداز میں پیش کیا ہے کہ قاری اُن سے متاثر ہی نہیں ہوتا بلکہ اُس میں خود کو اور اپنے سماج کو بدلنے کی خواہش بھی پیدا ہوتی ہے۔

کرشن چندر کی ایک خوبی اُن کا منفرد و دلکش اسلوب ہے۔ اُن کی نثر پڑھتے ہوئے ایسا احساس ہوتا ہے جیسے ہم کوئی شعری تخلیق پڑھ رہے ہوں۔ علاوہ ازیں اُن کی تخلیقی نثر میں پایا جانے والا جو طنز ہے اُس کا جواب نہیں۔ ان کی طنزیہ تخلیقات میں "ایک گدھے کی سرگزشت" کو تو غیر معمولی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی، یہاں تک کہ جواہر لال نہرو تک بھی اس کی شہرت پہنچ گئی تھی اور اس کے کچھ حصے شاید انھیں پسند نہیں آئے تھے اور وہ ان سے اس قدر خفا تھے کہ جب سوویت لینڈ ایوارڈ کی تقریب میں انھوں نے ہری ونش رائے وچن وغیرہ سے ہاتھ ملایا تو انھیں جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا۔ جب ارونا آصف علی نے کرشن چندر کی جانب اشارہ کر کے انھیں متوجہ کیا اور کہا کہ جواہر کیا آپ انھیں نہیں جانتے؟ تو نہرو جی نے جواب دیا، جانتا ہوں یہ وہی "ایک گدھے والے" ہیں۔ تاہم اس میدان میں اُن کا کوئی مدِ مقابل نہیں۔ اُن کے طنز کی گونج عارضی نہیں ہوتی اور وہ قاری پر اپنا مستقل تاثر چھوڑتی ہے۔ اُن کی متعدد طنزیہ تخلیقات جیسے پشاور ایکسپریس، جامن کا پیڑ، باپو کی واپسی، عورتوں کا عطر، اُردو کا نیا قاعدہ، مینڈک کی گرفتاری، اُلٹا درخت وغیرہ میں فرقہ واریت، مذہبی تعصب، نوکر شاہی، قدامت پرستی کے خلاف ایسے اچھوتے انداز میں طنز کیا گیا ہے کہ لوگ آج بھی انھیں نہیں بھولے اور ان طنزیہ شہکاروں کا حوالہ موقع بہ

موقع دیا جاتا رہا ہے اور مستقبل میں بھی دیا جاتا رہے گا۔

کرشن چندر کے افسانوں میں جو روانی، شعریت اور تاثر ہے وہ بہت کم کہانی نویسوں میں پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اُن کی تحریریں قاری پر اپنا امٹ نشان چھوڑتی ہیں۔ وہ صرف سماجی نابرابری اور استحصال پر ہی نہیں بلکہ اُن اصولوں اور خیالات ونظریات پر بھی طنز کرتے ہیں جو انسانی مساوات، مذہبی بھائی چارے، ہم آہنگی، پیار دوستی اور بنیادی اقدار کے خلاف ہیں۔ وہ ہر مذہب کا احترام کرتے ہیں مگر مذہب کے نام پر استحصال اور لوٹ کھسوٹ کو برداشت نہیں کرتے اور اپنی تخلیقات کے توسط سے وہ ان کے خلاف آواز بلند کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے۔ اسی طرح سرمایہ داروں، کارخانہ داروں، زمینداروں، جاگیرداروں، سیٹھ ساہوکاروں کے ذریعہ مزدروں، کسانوں، اور محنت کشوں پر کیے جانے والے استحصال اور مظالم کو بھی اپنے طنز کا نشانہ بناتے ہیں اور ان بدعتوں کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں۔

کرشن چندر اُن کہانی نویسوں میں سے ہیں جو زندگی کے بارے میں واضح اور ناقدانہ رجحان ورویہ رکھتے ہیں۔ اُن کا نقطہ نظر سماج واد اور مارکس واد پر مبنی ہے اور اسی کی بنیاد پر انھوں نے زندگی، فرد اور سماج کا جائزہ لیا ہے اور انھیں اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ اُن کی تخلیقات میں جو گہری انسان دوستی، فرقہ وارانہ ہم آہنگی، بھائی چارے اور محبت واخوت کے تئیں ہمدردانہ جذبات پائے جاتے وہ انھیں دیگر افسانہ نگاروں سے ممتاز اور منفرد بنا دیتے ہیں۔

اُن کی تحریریں دوسری جنگِ عظیم، جنگِ آزادی، کسان اور مزدوروں کی تحریکوں سے متاثر ہیں اور اس کی جھلک اُن کی تخلیقات میں واضح طور پر نظر آتی ہیں۔ انھوں نے اپنی ابتدائی زندگی میں کشمیر کے حسن اور اُس کی مفلسی سے متعلق کہانیاں لکھیں۔ ان میں جہاں انھوں نے کشمیر کے حسن کی تعریف وتوصیف کی ہے وہیں کشمیریوں کی غربت اور ناگفتہ بہ حالت کو ایسا بیان کیا ہے کہ اُن کے تئیں قارئین کے دل میں ہمدردی اور رحم دلی کا جذبہ ٹھاٹھیں مارنے لگتا ہے اور وہ اس سے بے حد متاثر ہوتے ہیں۔

کرشن چندر کے افسانوں میں حسن اور فطرت کی تصویر کشی کے ساتھ ساتھ حقیقت نگاری بھی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے اپنے ابتدائی ادبی دور میں ''جہلم میں ناؤ پر''، ''زندگی کے موڑ پر''، اور ''دو فرلانگ لمبی سڑک'' ایسے یادگار افسانے لکھ کر سرِ فہرست افسانہ نگاروں میں اپنے کو شمار کرا لیا تھا کیونکہ انھوں نے عام ڈگر سے ہٹ کر ایک نیا راستہ اپنایا تھا۔ ان کے افسانے کرداروں پر

مبنی افسانے نہیں ہیں۔ انھوں نے اپنی کہانیوں میں دیش، سماج اور عوام کے مسائل کو اپنا موضوع بنایا تھا اور ہمیں ''تین غنڈے'' ''باپو کی واپسی''، ''جامن کا پیڑ'' اور ''ان داتا'' ایسے ناقابلِ فراموش افسانے عطا کیے۔

بقول ممتاز نقاد پروفیسر محمد حسن:

''کرشن چندر کی کہانیوں میں ایک ایسے حساس فنکار اور جواں فکر انسان کا دل دھڑکتا سنائی دیتا ہے جو پیاروں کا پیارا ہے اور دُکھیاروں کا عاشق ہے۔ اُس کی تحریروں میں سماجی ناانصافی، ظلم و جبر، دقیانوسیت اور ظلمت پرستی کے خلاف مسلسل اور ایماندارانہ جہاد نے ایسی انوکھی صلابت اور توانائی پیدا کردی تھی جس کی مثال اُردو ادب میں موجود نہ تھی۔ اُن کی کہانیوں کا سفر رُومان سے شروع ہوا اور یہ رُومانی سرمستی، نزاکت اور لطافت، کیف زائی اور اظہارِ ذات کی طرب نائی اور سرشاری اُن کے اسلوب میں آخر تک قائم رہی۔ ایسی سجی ہوئی نثر اتنی واقعیت اور کاٹ کے ساتھ کسی اور نے نہیں لکھی۔ کرشن نے اُس نثری اسلوب میں جو یلدرم، حجاب اور نیاز کی تحریروں کی یاد دلاتا تھا، سماجی آگہی کی ایک جوئے رواں لاڈالی اور فکر و احساس کی قوت پیدا کردی۔ رومانیت کی سرحدوں کی یہ توسیع 'کرشن کا کارنامہ' ہے۔''

یہی نہیں کرشن چندر نے اپنے افسانوں کے ذریعے جتنے تجربے کیے ہیں شاید کسی اور اُردو افسانہ نگار نے نہیں کیے۔ 'پشاور ایکسپریس'، 'بُت جاگتے ہیں'، 'پانی کا درخت' اور 'ان داتا' ایسے متعدد افسانے اسی کیٹیگری میں آتے ہیں جنھیں ہم کبھی بھلا نہیں پائیں گے۔

یہی نہیں جدیدیت کی لہر سے بہت پہلے انھوں نے تجربے کے طور پر ''مردہ سمندر''، ''چوراہے کا کنواں'' اور ''گڑھا'' ایسے منفرد جدید افسانے لکھے جن میں موضوع کے ساتھ برتاؤ علامتی اور تجریدی ہے۔

اگرچہ عورت اُن کے نزدیک حسن و جمال کی علامت وشبیہ ہے مگر وہ اُسے شہوت وہوس کے لیے استعمال کی جانے والی شے نہیں سمجھتے۔ وہ اُس کا احترام کرتے ہیں اور اُس کی ترقی و بیداری کے لیے ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ ہندوستان کی مظلوم اور دکھی عورت سے اُن کی بے انتہا ہمدردی ہے۔ اُن کے یہاں عورت کے مختلف روپ ملتے ہیں اور اس کا ہر روپ دلکش اور دل کو لبھانے

والا ہے۔ اُن کے افسانوں کی عورت اکثر سماج کی ٹھکرائی ہوئی ہے جو ظلم و ستم برداشت کرتی ہے اور مقابلہ کرتی ہے۔ اُن کی تخلیقات میں عورت، دکھ درد اور بے بسی کا مجسمہ ہے۔ وہ اپنی ہر کہانی میں انسان کے دکھ درد کی تصویر پیش کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ سماج میں پسماندہ طبقوں کو اُن کا حق ملے اور وہ بھی سر اونچا کر کے آرام و فراغت کی زندگی گزار سکیں۔ اس لیے انھوں نے اپنی کہانیوں کو حقیقت کے زیادہ قریب لانے کی کوشش کی اور یہی ان کی افسانہ نویسی کا مقصد تھا۔ جیسا کہ انھوں نے ترقی پسند مصنفین کانفرنس بھوپال میں اپنے خطبۂ صدارت میں کہا تھا:

''ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہماری شاعری اور ہماری افسانہ نگاری اور ہماری مضمون نگاری چند ایک کاوشوں کو چھوڑ کر ابھی تک آسمان سے نہیں اُتری ہے۔ .... ہمارے ادب کی اصناف میں مجھے اپنے غریب گھروں کا نقشہ نہیں ملتا۔ اپنے کسانوں کے گیت نہیں ملتے۔ اپنے مزدوروں کی دن رات کی جاں سوز کاوشیں نہیں ملتیں۔ اُس میں مزدور عورت کی ٹوٹی ہوئی کنگھی کا ذکر نہیں۔ جس کے دندانوں میں بال پھنسے ہوئے ہیں۔ اُس ڈبو کُتے کا ذکر نہیں ہے جسے منوہر اپنے ساتھ صبح سویرے ہل چلانے کے وقت کھیتوں میں اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ اُس میں اُس شوخ، نڈر، بیباک محبت کے گیتوں کا ذکر نہیں ہے جو گاؤں کی عورتیں اپنے پیاروں کے لیے دوپہر کے وقت کھیتوں میں کھانا لے جاتے ہوئے، منڈیروں پر چڑھتے ہوئے گاتی ہیں۔ اس میں ان لباسوں کا ذکر نہیں ہے جن سے گوبر کی بُو آتی ہے۔ ہمارے ادب میں کہیں باتھو کے ساگ کا ذکر نہیں ہے۔ اس وقت ہمارے ادب کو بوئے ختن اور گیسوئے تتار کی ضرورت نہیں، اُسے باتھو کے ساگ کی ضرورت ہے۔''

اپنے افسانوں میں منظر نگاری کرنے میں بھی انھوں نے کمال کر دکھایا ہے۔ اپنی تخلیقات میں کسی مقام کے منظر کو ایسے دلکش اور خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے کہ اُسے پڑھتے ہوئے ہمارے سامنے وہ منظر ایسے نمودار ہو جاتا ہے جیسے ہم پردۂ اسکرین پر اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں، جیسے کہ ''پورے چاند کی رات'' کا یہ منظر:

> ''اپریل کا مہینہ تھا۔ بادام کی ڈالیاں پھولوں سے لد گئی تھیں اور ہوا میں برفیلی خنکی کے باوجود بہار کی لطافت آگئی تھی۔ بلند و بالا تنگوں کے نیچے مخملیں دوب پر کہیں کہیں برف کے ٹکڑے سفید پھولوں کی طرح کھلے ہوئے نظر آرہے تھے۔ اگلے ماہ تک یہ سپید پھول اسی دوب میں جذب ہو جائیں گے اور دوب کا

رنگ گہرا سبز ہو جائے گا اور بادام کی شاخوں پر ہرے ہرے بادام پکھراج کے نگینوں کی طرح جگمگائیں گے اور نیلگوں پہاڑوں کے چہروں سے کہرہ دُور ہوتا جائے گا۔ اور اس جھیل کے پُل کے پار پگڈنڈی کے پُل کے پار پگڈنڈی کی خاک ملائم بھیڑوں کی جانی پہچانی ''با آ آ'' سے جھنجھنا اُٹھے گی اور پھر ان بلند و بالا تنگوں کے نیچے چرواہے، بھیڑوں کے جسموں سے سردیوں کی پلی ہوئی موٹی موٹی گف اُون کترتے جائیں گے اور گیت گائے جائیں گے''۔

اُن کی افسانہ نگاری کی مقبولیت اور شہرت کا ڈنکا اُن کے ابتدائی ادبی دور میں ہی بجنے لگا تھا اور انھوں نے کسی ایک مخصوص موضوع پر ہی نہیں بلکہ زندگی کے ہر پہلو اور ہر موضوع پر خامہ فرسائی کی تھی اور ایسے لاجواب افسانے لکھے تھے جنھیں قاری بار بار پڑھتا ہے اور سر دھنتا ہے۔ وہ کہانی کی دنیا کے جادوگر تھے اور اُن کا جادو سر چڑھ کر بولتا تھا اور برسوں بیت جانے پر بھی ان کی کہانیوں کی خوشبو کم نہیں ہونے پائی بلکہ آج بھی اسی طرح افسانوی دنیا کو معطر کیے ہوئے ہے۔ اُن کا مسحور کن اور شعریت سے بھرپور رواں دواں اندازِ تحریر اتنا مقبول تھا کہ کئی ادیبوں نے اُس کی تقلید کرنے کی کوشش کی مگر اس کی گرد تک بھی نہ پہنچ سکے۔

اُن کی وفات پر انھیں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے ممتاز محقق و نقاد پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اُن کی کہانیوں کا تجزیہ ان الفاظ میں کیا تھا:

''...... اگرچہ اُس دور کی کچھ کہانیاں مثلاً 'کالو بھنگی'، 'مہا لکشمی'، 'برہمپتر'، 'پانی کا درخت' ہمیشہ زندہ رہیں گی، لیکن شاید اس بات کو بھی نظرانداز نہ کیا جا سکے گا کہ اُن کی قوتِ مشاہدہ اور نفسیاتی نظر 'زندگی کے موڑ پر' کے افسانوں میں اپنی معراج پر ملتی ہے۔ 'بالکونی' میں اگرچہ وہ بیتھوون کی دھن کے صرف نشاطیہ پہلو پر اصرار کرتے ہیں لیکن یہ وہ دَور تھا جب کرشن چندر بہار کو حنائے پائے خزاں کے طور پر بھی دیکھ سکتے تھے۔ 'اَن داتا'، 'پشاور ایکسپریس' اور 'ہم وحشی ہیں' میں انھوں نے انسانی دکھ درد اور وحشت و سفاکی کے جو مرقعے پیش کیے ہیں وہ لازوال ہیں۔ ایسی سادہ اور دل آویز نثر لکھنے والا جس کی تازگی، نشاط آگینی اور جمال آفرینی اپنی نظیر آپ تھی، اب کہاں سے آئے گا۔ جذبے کی آنچ سے کپکپاتی ہوئی نثر جو دل و دماغ کو یکلخت مسحور کر لیتی تھی، اب کون لکھے

گا؟ ایسا جادوگر، ایسا کھرا انسان، ایسا سچا فنکار کیا کبھی دِلوں سے جا سکتا ہے؟''

کرشن چندر بلاشبہ ترقی پسند ادب کی ایک بہت بڑی دین ہیں۔ انھوں نے اُردو افسانے کو ایک نئے رجحان اور موڑ سے آشنا کیا اور اُسے بلندیوں تک پہنچانے اور اُسے دنیا کے دوسری زبانوں کے مدِ مقابل لانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ وہ ایک ایسے منفرد اور عظیم المرتبت افسانہ نگار تھے جو اپنی زندگی میں ہی ایک لی جینڈ بن گئے اور جن کی شہرت ملک کی سرحدوں کو پار کر کے ساری دنیا میں پھیل گئی اور انھیں 'ایشیا کا عظیم افسانہ نگار' کہا جانے لگا۔

◆◆◆

کرشن چندر بحیثیت ناول نگار

کرشن چندر اُردو ادب میں ایک ہمہ جہت شخصیت تھے۔ انھوں نے جہاں سینکڑوں افسانے لکھے وہاں کوئی پچاس سے زائد ناول بھی لکھے مگر ان کے ناولوں کو وہ شہرت و پسندیدگی نہ مل سکی جو انھیں افسانوں میں ملی ہے۔ اگر وہ ذرا اس صنف پر زیادہ توجہ دیتے تو شاید کچھ بہتر ناول اُردو فکشن کو عطا کر پاتے مگر زود نویسی اور شاید پیسے کی ضرورت نے انھیں اس کی مہلت نہ دی اور وہ جلدی جلدی ناول لکھنے میں مصروف رہے پھر بھی اُن کے کئی ناول ایسے ہیں جنھیں کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکے گا۔ 'شکست' چوں کہ اُن کا پہلا ناول تھا اور وہ انھوں نے فرصت و فراغت کے زمانے میں بڑے غور و فکر کے بعد لکھا تھا لہٰذا اُس کی ادبی حلقوں میں اچھی پذیرائی ہوئی۔ اسی طرح اُن کے ناول "گدھے کی واپسی" کو بھی اتنا پسند کیا گیا کہ اُردو کے علاوہ اسے کئی دیگر زبانوں میں شائع ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ اس کے علاوہ بھی کئی یادگار ناول ہیں مگر افسانے کے مقابلے میں وہ بہت پیچھے رہ گئے اور انھیں بطور افسانہ نگار ہی یاد رکھا جائے۔ جیسے کہ ان کی فکشن پر اپنی گراں قدر رائے کا اظہار کرتے ہوئے ممتاز محقق و نقاد پروفیسر گیان چند جین نے لکھا ہے کہ:

> "انھوں نے ناول بکثرت لکھے لیکن میری رائے میں وہ ناول نگار سے بہتر افسانہ نگار تھے۔ اُن کا بہترین ناول 'شکست' ہے اور وہ ایک رومانی ناول ہے۔ اُردو کے پچاس بہترین افسانوں کا انتخاب کیا جائے تو اُن میں سب سے زیادہ افسانے غالباً کرشن چندر کے ہوں گے لیکن اُردو کے بہترین دس ناولوں کے نام طے کیجیے اُن میں کرشن چندر کا کوئی ناول جگہ نہ پا سکے گا۔ بہت عرصے سے میرے ذہن میں یہ خیال کوندتا رہتا ہے کہ کرشن چندر اُردو کا وہ عظیم ناول نگار

ہے جس نے کوئی عظیم ناول نہیں لکھا۔ اس کے باوجود یہ بھی صحیح ہے کہ ادبی ناول نگاروں میں وہ مقبول ترین تھے۔ میں جس رغبت اور شوق سے اُن کے ناول پڑھتا ہوں کسی اور کے نہیں۔"

کرشن چندر نے مختلف موضوعات، واقعات اور حالات پر مبنی کئی ناول قلمبند کیے جن میں بعض کو بڑی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی اور آج بھی ان کا ذکر اکثر ادبی گفتگو، مباحثے اور مذاکرے میں ہوتا رہتا ہے اور ان کے ناولوں کے کرداروں کے جیتے جاگتے روپ، مشاہدے اور تجربے کا وسیع کینوس اور واقعات میں ربط و ضبط اور ان میں ہم آہنگی قاری کو اپنی گرفت میں جکڑ لیتی ہے علاوہ ازیں اُن ناولوں میں سماجی اور سیاسی شعور اور انسانی مسائل و نفسیات کو پیش کرنے کا انداز انھیں دیگر ناول نگاروں سے منفرد و ممتاز بنا دیتا ہے۔ یہی نہیں ان میں، جذباتیت، منظر نگاری اور حقیقت نگاری نے انھیں ایسا دلچسپ بنا دیا ہے کہ آپ ان کی جکڑ سے بچ نہیں سکتے۔ ان کے ناولوں میں یہ بھی ایک خاصیت ہے کہ وہ زیادہ طویل نہیں ہوتے اور ان میں کرداروں کی بھی بھیڑ نہیں ہوتی اور اُن کا سماجی شعور اور سیاسی مسلک اور انسان کے تئیں اُن کا رجائی رویہ ان میں زندگی کی روح پھونک دیتا ہے مگر یہ بات بھی ماننی پڑے گی کہ بسیار نویسی نے ان کے ناولوں کو بڑا نقصان پہنچایا ہے۔ اُن میں کوئی ایسا ناول نہیں جسے " آگ کا دریا" کے مقابلے میں کھڑا کر سکیں۔ خود کرشن چندر کو بھی احساس تھا کہ ابھی انھوں نے کوئی بڑا ناول نہیں لکھا۔ اس لیے ان کی خواہش تھی کہ اگر زندگی میں انھیں فرصت و فراغت ملے تو وہ کشمیر جا کر ٹالسٹائی کے " وار اینڈ پیس" کی طرح کوئی بڑا ناول تخلیق کریں۔ پھر بھی ان میں کئی ناول ایسے ہیں جنھیں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا اور ان میں کئی ناول تو ایسے ہیں جن کا ذکر ہمیشہ کیا جاتا رہے گا۔ اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ کرشن چندر بنیادی طور پر افسانہ نگار ہی رہیں گے اور اسی میدان میں اُن کی عظمت و شہرت کے چرچے تا ابد ہوتے رہیں گے۔

یہاں ہم اُن کے کچھ ناولوں کا سرسری تذکرہ کرتے ہیں تا کہ قارئین اُن کی ناول نویسی کے بارے میں کچھ جانکاری حاصل کر سکیں:

شکست:

کرشن چندر نے پہلا ناول 'شکست' ماہنامہ ساقی کے مدیر شاہد احمد دہلوی کی فرمائش پر

۱۹۴۳ء میں قلمبند کیا تھا جو اُن ہی کے مطبع سے اشاعت پذیر ہوا۔ شیام اس ناول کا اہم کردار ہے جس کے اردگرد ناول کا تانابانا بُنا گیا ہے۔ وہ ایک باغیانہ اور انقلابی خیالات رکھنے والا اور خواب دیکھنے والا نوجوان ہے۔ وہ اپنے وطن کے فرسودہ نظام اور قدامت پرست سماج میں تبدیلیاں لانے کا خواہاں ہے مگر اُس میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ انھیں عملی جامہ پہنا سکے۔ وہ ونتی سے شادی کرنا چاہتا ہے لیکن اس کے گھر والے اس کی شادی اس کی مرضی کے خلاف کہیں اور طے کر دیتے ہیں اور وہ اس کے خلاف آواز بلند کرنے کے بجائے خاموشی اختیار کر لیتا ہے۔ اس کے برعکس اس کی محبوبہ ونتی کی شادی ایک جاہل لڑکے کے ساتھ کر دی جاتی ہے مگر وہ شیام کو بھلا نہیں پاتی اور جب اسے شیام کی شادی کی خبر ملتی ہے تو وہ جان دے دیتی ہے اور شیام ایک شکست خوردہ نوجوان کی طرح چتا پر سر جھکا کر کھڑا رہ جاتا ہے۔ جو کہ اس کی شکستگی کی علامت ہے۔ اسی طرح موہن سنگھ اور چھایا بھی اس ناول کے اہم کردار ہیں جن کے پیار کی داستان اس میں قلمبند کی گئی ہے۔ ناول کے کردار شیام ونتی، چندرا، چھایا، موہن سنگھ، غلام حسین اور علی سب حقیقی کردار معلوم ہوتے ہیں۔ اس میں کشمیر کی غربت، مفلسی اور وہاں کے عوام پر کیے جانے والے مظالم کی عکاسی جگہ جگہ ملتی ہے۔ ان مظالم سے نبرد آزما ہونے کا ارادہ رکھنے والا شیام انتہائی کوشش کے باوجود بھی بزدل ثابت ہوتا ہے اور آخر کار شکست سے دوچار۔ وہ کچھ نہیں کر پاتا۔ اس کے برعکس موہن سنگھ اور چندرا کی محبت قاری کو زیادہ متاثر کرتی ہے کہ ان دونوں کی محبت اتنی مضبوط و مستحکم ہے کہ چندرا نہ تو اپنی ماں کی پروا کرتی ہے اور نہ برادری اور گاؤں والوں کی اور نہ سماج کے ٹھیکیداروں کی۔ تاہم اس ناول کی چھاپ بڑی گہری ہے اور اس کے سبھی کردار زندہ جیتے جاگتے معلوم ہوتے ہیں اور منظر نگاری بھی اس طرح کی ہے کہ انسان اُن میں کھو کر رہ جاتا ہے۔

اُن کا ناول ''ایک عورت ہزار دیوانے'' ۱۹۵۷ء میں اشاعت پذیر ہوا جسے یہاں ہی نہیں ، غیر ممالک میں بھی بڑا پسند کیا گیا اور اس کے کئی زبانوں میں تراجم بھی ہوئے۔ اس کی کہانی میں ایک مظلوم عورت لاجی کا اپنے خانہ بدوش قبیلے کے خلاف جذبۂ بغاوت دکھایا گیا ہے، جہاں عورت، گھوڑی اور زمین کو فروخت کرنا ایسا ہی فعل سمجھتا ہے جیسے کوئی جنس بیچنا مگر لاجی کسی قیمت پر بھی فروخت نہیں ہونا چاہتی لیکن اس کے والدین کچھ روپوں کی خاطر اپنے قبیلے کے ایک بوڑھے دمازو کے ساتھ اُس کا سودا کر لیتے ہیں لیکن لاجی اپنے عاشق لالہ گل سے شادی کے لیے اپنے والدین کے خلاف بغاوت کر دیتی ہے اور ایک معینہ مدت میں دمازو کو رقم واپس کرنے کا وعدہ کرتی

ہے۔ آس پاس کے کچھ اوباش لوگ اسے مالی امداد کی پیشکش کرتے ہیں اور اس کے عوض اسے اپنی ہوس کا شکار بنانا چاہتے ہیں مگر لاجی ایک حوصلہ مند اور خوددار عورت ہے وہ شادی کی رات دماز و کو قتل کر دیتی ہے اور جیل ہو جانے پر بھی ہمت نہیں ہارتی۔ وہ جیل کے افسروں اور ملازمین کو جو اس پر ہوسناک نگاہ رکھتے ہیں منہ نہیں لگاتی اور جب اس کے مسخ شدہ چہرے کی وجہ سے اس کا محبوب اسے چھوڑ دیتا ہے تو وہ انتہائی مفلسی اور ناداری کے باوجود اس کا منی آرڈر ٹھکرا کر اپنی غیرت، انا اور خودداری کا مظاہرہ کرتی ہے۔

کرشن چندر کے مذکورہ ناول کو ڈرامے کی شکل میں بھی پیش کیا جا چکا ہے اور اسے تاشقند کے مقیمی تھیٹر میں لگ بھگ ایک سال تک کھیلا جاتا رہا۔ علاوہ ازیں اس ناول کو فارسی زبان میں ''یک عورت و ہزار دل باختہ'' کے عنوان سے بھی شائع کیا گیا ہے۔

''جب کھیت جاگے'' اُن کا ایک ایسا دلپذیر ناول ہے جس میں تلنگانہ کے محنت کشوں اور جاگیرداروں کے درمیان طبقاتی جنگ اور اس میں جاگیرداروں کے محنت کشوں پر کیے جانے والے ظلم و استحصال بڑے رقت انگیز پیرائے میں پیش کیے گئے ہیں۔ اس میں رگھوراؤ تلنگانہ کے بے بس اور لاچار کسانوں اور محنت کشوں کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے۔ اس میں جاگیرداروں کے جبر و استبداد اور زیادتیوں کے خلاف محنت کش طبقے کی جدوجہد اور احتجاج کو بھرپور انداز میں دکھایا گیا ہے۔

اسی طرح 'طوفان کی کلیاں' (۱۹۵۴ء) میں ریاست جموں و کشمیر میں غریب اور نادار کسانوں پر جاگیرداروں کے ظلم و جبر کی تصویر کشی ایسے دلپذیر بیانیہ میں کی گئی ہے کہ ہمارے دل میں اس طبقے کے خلاف غم و غصہ اور نفرت کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔

'دل کی وادیاں سو گئیں' (۱۹۵۶ء) میں بھی طبقاتی جدوجہد، اونچ نیچ کے امتیاز اور معاشی نابرابری سے پیدا ہونے والی صورت حال کی منظر کشی بڑے دلکش انداز میں کی گئی ہے۔ کہانی ایک نوجوان گریجویٹ نریندر اور ایک راجکماری کی اتفاقیہ ملاقات پر مبنی ہے جن میں ایک ٹرین میں سفر کرتے ہوئے ایک حادثے کی وجہ سے ایک ریگستان میں قیام کرنے کے دوران دوستی ہو جاتی ہے اور پھر وہ راجکماری کو ڈاکوؤں کے چنگل سے بچانے میں مددگار ثابت ہوتا ہے مگر جب ریلیف ٹرین آتی ہے تو راجہ کے ساتھ وہ اپنے اسپیشل ڈبے میں بیٹھ کر چلی جاتی۔

''آسمان روشن ہے'' میں جنگ کی ہولناکیوں اور بربادیوں کے خلاف آواز بلند کی گئی ہے

اور بتایا گیا کہ جنگجو افراد یا گروہ اپنے ذاتی مفاد کی خاطر پوری انسانی تہذیب و تمدن کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔ اس ناول کا ہیرو اسحاق اپنی بدقماش محبوبہ جمیلہ کی بے وفائی سے تنگ آ کر خودکشی کا ارادہ کرتا ہے اور اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے سب اثاثہ فروخت کر کے بمبئی سے کھنڈالا چلا جاتا ہے جہاں وہ سات دن عیش و عشرت کے بعد خودکشی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے وہاں اس کی ملاقات ایک جرمن خاتون سے ہوتی ہے جو خود جنگ کی ستائی ہوئی ہے اور اس کے فعل و عمل سے متاثر ہو کر وہ اپنا ارادہ بدل دیتا ہے۔ اس میں جنگ کے خلاف تشہیر و تبلیغ کے ساتھ ہندوستان میں امن اور بھائی چارے کی بات بھی کی گئی ہے، ملاحظہ کریں:

> ''میں اسحاق غدار ہوں۔ بالکل سو فی صدی مکمل غدار ہوں۔ تمھارا اور تمھارے ایسے اُن تمام لوگوں کا جو ہندوستان اور پاکستان میں جنگ چاہتے ہیں اور میں تم کو یہ بھی بتا دوں سیٹھ کہ میں تُم اور تمھارے ایسے لوگوں کا ہی غدار نہیں ہوں، میں تو ہر اُس آدمی اور ہر اُس عقیدے کا غدار ہوں جو نہ صرف ہندوستان اور پاکستان بلکہ کسی بھی دو ملکوں کے درمیان جنگ چاہتا ہے۔ میں تو غدار ہوں نفرت اور جنگ کا اور بربادی کا...... اور وفادار ہوں قوموں کے درمیان محبت کا، وفا کا اور پیار کا۔ میں تو وفادار ہوں بہنوں کی عصمت کا اور محبوبوں کے پیار کا اور دشمن ہوں عورتوں کی بیوگی کا، محبت کے قاتلوں کا اور تمھارے ایسے منافع خور سوداگروں کا جو اسٹاک ایکسچینج پر غریب لوگوں کی قبریں بیچتے پھرتے ہیں۔''
>
> (آسمان روشن ہے از کرشن چندر ایشیا پبلشرز، ص: ۷۳۔۷۴)

کرشن چندر نے بمبئی اور پونے کے قیام کے دوران فلمی دنیا کے پردے کے پیچھے ہونے والے کئی واقعات اور حالات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور پھر چار ناولوں باون پتے (۱۹۵۷ء)، سڑک واپس جاتی ہے، درد کی نہر (۱۹۶۳ء) اور چاندی کے گھاؤ (۱۹۶۴) میں انھیں ایسے دلکش اور خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے کہ وہاں پردے کے پیچھے ہونے والے واقعات کی ہو بہو تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے گھوم جاتی ہے... اول الذکر اس موضوع پر اُن کا پہلا ناول ہے اور اس میں بمبئی کی زندگی کے گھناؤنے اور کریہہ پہلوؤں کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ یہ ایک کھاتے پیتے گھرانے کے نوجوان کی کہانی ہے جو اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر فلمی اداکار بننے بمبئی چلا جاتا ہے جہاں بہت سی پریشانیوں اور کٹھنائیوں کے بعد اُس کی رفیعہ سے ملاقات ہو جاتی ہے اور وہ فلم

اداکار بن جاتا ہے۔ اس ناول میں جگمگاتی اور گلیمر بھری دنیا کے پردے کے پیچھے کے گھناؤنے اور غیر اخلاقی حالات کو پیش کر کے فلمی دنیا کے ناخداؤں کے حقیقی چہرے سے نقاب اُٹھانے کی کوشش کی گئی ہے مگر ادبی اور فنی لحاظ سے یہ ناول زیادہ قابلِ اعتنا نہیں۔ ہاں اس کے مطالعہ سے آپ کو فلمی دنیا کی ظاہری اور باطنی زندگی سے اچھی جانکاری مل جاتی ہے اور آپ اس چمک دمک والی پُرکشش دنیا کا پردہ یوں اُٹھتے ہوئے دیکھتے ہیں جیسے سب کچھ آپ کی نظروں کے سامنے رونما ہو رہا ہو۔

اسی طرح ''غدار'' میں حصول آزادی کے دوران پنجاب میں ہوئے خوں ریز فرقہ وارانہ فسادات کے دوران ایک ہندو لڑکی کی ایک مسلم لڑکے سے اور ایک ہندو نوجوان بیج ناتھ کی ایک مسلمان لڑکی سے عشق کی داستان کو بڑے دلگداز انداز میں پیش کیا گیا ہے جس میں بیج ناتھ کسی مذہب میں نہیں انسانیت میں اعتماد رکھتا ہے وہ ایسا مثالی کردار ہے جو قاری پر گہرا تاثر چھوڑتا ہے۔

''زرگاؤں کی رانی'' میں ایک پہاڑی ریاست کے پس منظر میں ایک گزشتہ دور کی اقدار اور کرداروں کے ذریعے کہانی کا تانا بانا بُنا گیا ہے۔

کرشن چندر کے طنزیہ ناولوں میں ایک گدھے کی سرگزشت (۱۹۵۷ء) کو بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی ہے اور اس ناول سے اُردو کا ہر فرد اچھی طرح واقف ہے اور قارئین نے اسے بے انتہا پسند کیا تھا۔ اور اس میں ہمارے معاشرے میں جو سیاسی، سماجی اور اخلاقی برائیاں در آئی ہیں اُن کو طنز و مزاح کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ اس میں ہمارے قدامت پسند معاشرے، بے حس نوکر شاہی، چالاک اور شاطر سیاست دانوں، روحانی اقدار کے فقدان اور ماڈرن دور کی فیشن زدہ خواتین کی اخلاقیات ایسے ہر مسئلے پر بڑا تیکھا اور چبھتا طنز کیا گیا ہے۔ اس ناول کی کامیابی کے بعد کرشن چندر نے دو اور ناول گدھے کی واپسی (۱۹۶۲ء) اور ایک گدھا نیفا میں (۱۹۶۴ء) بھی لکھے مگر انھیں وہ قبولیت نہ ملی جو ''ایک گدھے کی واپسی'' کو ملی تھی۔ ان کے علاوہ انھوں نے آئینے اکیلے ہیں (۱۹۷۲ء) برف کے پھول (۱۹۶۱ء) پانچ لوفر (۱۹۶۶) پیار ایک خوشبو، (۱۹۷۱ء) دادر پل کے بچے وغیرہ کے علاوہ بچوں کے لیے بھی کئی دلچسپ ناول لکھے جیسے اُلٹا درخت، بہادر گار جنگ (۱۹۶۹ء) بیوقوفوں کی کہانیاں، چڑیوں کی الف لیلہ، خرگوش کا سپنا (۱۹۶۱ء) ستاروں کی سیر (۱۹۶۱ء) سونے کا سیب (۱۹۵۷ء) سونے کی صندوقچی، شیطان کا تحفہ، لال تاج (۱۹۵۴ء) ہمارا گھر (۱۹۶۶ء) وغیرہ۔

بچوں کی ان کتابوں میں کرشن چندر نے اپنی جدت طرازی اور انوکھے پن کو بروئے کار لاکر بچوں کے لیے ایسے دلچسپ ادب کی تخلیق کی ہے جو بچوں کے لیے دیگر گھسے پٹے انداز میں لکھی کتابوں سے انداز و اسلوب میں بالکل مختلف ہیں اور ان میں انھوں نے نئے تجربے بھی کیے ہیں۔ اُلٹا درخت میں انھوں نے اپنے سیاسی، سماجی اور معاشی نظریات کو تمثیلی رنگ میں پیش کیا ہے اور اس فنتاسی کے ذریعے وہ انسان میں پائی جانے والی ذات پات کی تفریق، سماجی نابرابری اور رنگ ونسل کے امتیاز کو ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ انسان میں کوئی تفریق نہیں ہونی چاہیے اور اُن کی زندگی کا منتہائے مقصود یہ ہو کہ نہ کالا سفید پر حکومت کرے نہ سفید کالے پر بلکہ دونوں مل جُل کر رہیں۔

بہادر گار جنگ سیریز میں کرشن چندر نے ٹارزن کے کردار کو اپنے سامنے رکھ کر پانچ سلسلہ وار ناول لکھے، جیسے چمبک کا قلعہ، نیل ہرن، کانچ کا گولہ، خفیہ محل اور موتیوں کی جھیل۔ یہ ناول اتنے دلچسپ اور دلکش ہیں کہ انھیں بچے ہی نہیں، بڑے بھی بڑے ذوق وشوق سے پڑھتے رہے ہیں اور اس سیریز کے ناولوں کے اُوپر لکھا بھی ہوتا تھا:

''سات سال سے ساٹھ سال کے بچوں کے لیے''۔

◆◆◆

کرشن چندر ایک نظر میں

نام: کرشن چندر

ولادت: ۲۳ر نومبر ۱۹۱۴ء (بحوالہ تذکرہ ماہ و سال از مالک رام)

جائے ولادت: بھرت پور راجستھان۔ (ان کے والد گوری شنکر چوپڑا وہاں بحیثیت ڈاکٹر تعینات تھے۔)

آبائی وطن: بھرتپور (راجستھان)۔ بعض جگہ وزیر آباد شہر (پنجاب) لکھا ہے۔

والد کا نام: گوری شنکر چوپڑا۔ (وفات دہلی)

والدہ کا نام: پرمیشوری دیوی (وفات ۲۵ر جنوری ۱۹۶۹ء دہلی)

بھائی بہن: تین بھائی مہندر ناتھ (۱۹۱۷ء بھرت پور۔ وفات ۲۰ر مارچ ۱۹۷۴ء ممبئی، بعارضۂ قلب)، بھوشن (چھ سال کی عمر میں وفات) اور اپیندر ناتھ عرف اومی (۱۰ر نومبر ۱۹۲۶ء۔ وفات ۲۱ر فروری ۲۰۱۴ء روہنی، دہلی) تھے اور ایک بہن سرلا دیوی (پیدائش ۱۹۲۳ء مہندر۔ وفات ۸ر مئی ۱۹۷۵ء دہلی) تھیں جو اُردو کی ایک معروف افسانہ نگار اور نامور ڈراما نگار ریوتی سرن شرما کی اہلیہ تھیں، ان کی ایک اسکوٹر ایکسیڈنٹ میں بمقام دہلی وفات ہوگئی تھی۔

تعلیم: ایم اے ایل ایل بی۔ (۱۹۲۹ء میں پونچھ سے میٹرک کرنے کے بعد، ۱۹۲۹ء میں انٹر کے لیے فارمن کرسچین کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ ۱۹۳۱ء میں ایف ایس سی اور ۱۹۳۳ء میں بی اے کیا۔ ۱۹۳۵ء میں ایم اے کرنے کے بعد انھوں نے ۱۹۳۷ء میں ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔

سرگرمیاں: نومبر ۱۹۳۹ء میں پطرس کی سفارش پر انھیں آل انڈیا ریڈیو لاہور میں

بطور 'پروگرام اسسٹنٹ' ملازمت مل گئی وہ ۱۹۴۱ء تک دہلی میں رہے۔ پھر اُن کا تبادلہ لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن پر ہو گیا جہاں وہ کوئی سوا سال بطور ڈراما انچارج رہے۔ ۱۹۴۲ء میں انھوں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور ۱۹۴۳ء میں پونے جا کر ڈبلیو زید احمد کی شالیمار پکچرز میں ملازمت اختیار کر لی۔

پہلا مضمون: ''مسٹر بلیکی''۔ اسکول کے زمانے میں اپنے ماسٹر بلاقی رام پر لکھا جس میں اُن کا خاکہ اُڑایا گیا تھا۔ یہ مضمون دیوان سنگھ مفتوںؔ کے رسالے ریاست دہلی میں شائع ہوا تھا جس پر اُن کو ڈانٹ ڈپٹ بھی پڑی تھی۔

پہلا افسانہ: ''یرقان'' 'ادبی دنیا' لاہور میں شائع ہوا۔ جس پر تبصرہ کرتے ہوئے مدیر رسالہ میاں صلاح الدین احمد نے لکھا تھا کہ اس افسانے کا شمار دنیا کے بہترین افسانوں میں ہو گا لیکن یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اُن کا پہلا افسانہ 'سادھو' فارمن کرسچین کالج کے میگزین میں ۱۹۳۲ء میں بھی چھپا تھا جب وہ کالج کے اسٹوڈنٹ تھے اور مہر لال سونی ضیا فتح آبادی میگزین کے اُردو سیکشن کے مدیر تھے۔

پہلا انشائیہ: ہوائی قلعے۔ ماہنامہ 'ہمایوں' لاہور کے ستمبر ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا۔

پہلا ڈراما: ''حجامت'' ۱۵؍ ستمبر ۱۹۳۷ء کو لکھا جو روسی مصنف اندریف کے ڈرامے سے ماخوذ تھا۔

پہلی شادی: اُن کی پہلی شادی ۱۹۴۰ء کے قریب لاہور میں وِدیا وتی ۱۹۱۵ء لاہور۔ ۸؍ اپریل ۱۹۹۴ء) سے ہوئی۔ جس سے اُن کے تین بچے ہوئے۔ دو بیٹیاں کپیلا (۱۱؍ اپریل ۱۹۴۲ء لاہور) اور الکا (پیدائش ۱۹۴۴ بمبئی ابھی کچھ سال پہلے ان کی وفات ہو گئی) اور بیٹا رنجن۔ (پیدائش ۲۴؍ جون ۱۹۴۸ء بمبئی)۔

دوسری شادی: سلمیٰ صدیقی سے ۷؍ جولائی ۱۹۶۱ء کو نینی تال میں نکاح ہوا۔ جس کے بعد اُن کی پہلی بیوی ودیا وتی نے سلمیٰ اور کرشن چندر کو کئی طرح سے پریشان کیا حتیٰ کہ اُن دونوں پر فوجداری کیس بھی کیا جس کے نتیجے میں جولائی ۱۹۶۳ء میں سلمیٰ اور کرشن چندر کے وارنٹ نکلے جس کی بنا پر دونوں کی گرفتاری ہوئی اور تھانے میں ضمانت ہوئی۔

فلموں سے وابستگی: ۱۹۴۱ء میں آل انڈیا ریڈیو سے استعفیٰ دے کر پونے میں بطور مکالمہ نویس

اوراسٹوری رائٹر ڈبلیو زیڈ احمد کی شالیمار کمپنی جوائن کی اور ایک رات (۱۹۴۲ء)، پریم سنگیت (۱۹۴۳ء) اورمن کی جیت (۱۹۴۴) کے مکالمے ر کہانی۔ پھر بمبئی آگئے اور کچھ مدت بمبئی ٹاکیز سے وابستہ رہے۔ بعدازاں خوددو فلمیں ''سرائے کے باہر'' اور ''راکھ'' بنائیں۔ پہلی فلم فلاپ ہوگئی اور دوسری بکسوں میں بند پڑی رہ گئی۔ اسے پردۂ اسکرین پر نمودار ہونے کا موقع نہ ملا، ان دونوں فلموں کے ہیرو اُن کے چھوٹے بھائی مہندرناتھ تھے۔ کرشن چندر نے لگ بھگ دو درجن فلموں کی کہانی اسکرین پلے اور مکالمے لکھے جن میں ان داتا، ہمراہی، دوچور، ممتا، من چلی، شرافت وغیرہ ہیں۔

اعزازات: اکتوبر ۱۹۶۶ء میں انھیں سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ سے نوازا گیا۔..... جنوری ۱۹۶۹ء میں اُن کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے حکومت ہند نے انھیں پدم بھوشن کے اعزاز سے سرفراز کیا۔

— نومبر ۱۹۷۳ء میں انھیں نہرو کلچرل ایسوسی ایشن لکھنؤ کا ایوارڈ عطا کیا گیا۔

— ۱۹۷۴ء میں فلمز ڈویژن نے اُن پر ایک دستاویزی فلم بنائی۔

— جنوری ۱۹۷۶ء میں مرکزی حکومت ہند کی وزارت اطلاعات ونشریات میں آل انڈیا ریڈیو کا پروڈیوسر ایمریٹس مقرر کیا گیا۔

— اُن کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اُن کے انتقال کے بعد مارچ ۱۹۷۷ء میں باندرہ کی ہل روڈ کا نام بدل کر کرشن چندر روڈ کردیا گیا۔ پونچھ میں جہاں اُن کا بچپن اور لڑکپن گزرا تھا وہاں پونچھ فاؤنٹن پارک کا نام کرشن چندر پارک کردیا گیا۔

قریبی دوست: کنہیا لال کپور، خواجہ احمد عباس، سعادت حسن منٹو، شیام (فلم اسٹار) عادل رشید۔ سردار جعفری، ساحر ہوشیار پوری، راجندر سنگھ بیدی، شیام کشن نگم، مجروح سلطان پوری، رام لعل، دھرم ویر بھارتی، کملیشور، فیض احمد فیض...

اہم کہانیاں: آدھے گھنٹے کا خدا۔ آگہی۔ آؤ مرجائیں۔ آئینہ خانے میں۔ اجنتا سے آگے۔ اُلٹا درخت۔ اُلجھی لڑکی کالے بال۔ امرتسر۔ انتظار۔ ان داتا۔ اندھے۔ ایک خوشبو اُڑی اُڑی سی۔ ایک روپیہ ایک پھول۔ ایک طوائف کا خط پنڈت جواہر لال نہرو

اور قائد اعظم جناح کے نام۔ ایک عورت ہزار دیوانے۔ ایک گرجا ایک خندق۔ باپو کی واپسی۔ بادام کی ڈالی۔ بارود اور چیری کے پھول۔ بالکونی۔ بُت جاگتے ہیں۔ برف کے پھول۔ برہم پتر۔ بے پنکھ فرشتہ۔ بیوی کترا۔ پاگل۔ پانی کا درخت۔ پرانے خدا۔ پنڈارے۔ پرتو۔ پشاور ایکسپریس۔ پورے چاند کی رات۔ پھانسی کے سائے میں۔ پھول کی تنہائی۔ پھول سرخ ہیں۔ تاش کا کھیل۔ تائی ایسری۔ تین غنڈے۔ ٹوٹے ہوئے تارے۔ جامن کا پیڑ۔ جفا کش۔ جہلم میں ناؤ پر۔ جیکسن ۔۔ چندرو کی دنیا۔ چینی پنکھ۔ دادر پُل کے بچے۔ درد کی نہر۔ دردِ گردہ۔ دسواں پُل ۔ دشتِ خیال۔ دل کسی کا دوست نہیں۔ دل کی وادیاں۔ دلیپ کمار کا نائی۔ دسواں پُل ۔ دسری برف باری کے بعد۔ دو فرلانگ لمبی سڑک۔ ڈوڈو۔ زندگی کے موڑ پر، سپنوں کا قیدی۔ سپنوں کی راہ میں۔ سفید پھول، سمندر دُور ہے۔ سونے کا صندوقچہ۔ سو روپے۔ سیمہ۔ شانو۔ شکست کے بعد۔ شمع کے سامنے۔ شوریدہ سر۔ شہزادہ، طلسمِ خیال، طوفان کی کلیاں، عقیدت نامے۔ غالیچہ۔ قومی شاعر۔ قیدی۔ کاک ٹیل ۔ کالا سورج۔ کالو بھنگی۔ کالے کوس۔ کانچ کے ٹکڑے۔ کتاب کا کفن۔ کبوتر کے خط۔ کچرا بابا۔ کھڑکیاں۔ کنواری۔ گلدان ۔ گلشن گلشن ڈھونڈا تجھ کو۔ گھونگھٹ میں گوری جلے۔ گیدڑ کی تلاش۔ لال باغ۔ لالہ گھسیٹا رام۔ مس نینی تال۔ مسکرانے والیاں۔ مقدس۔ مکڑی۔ موبی، مہالکشمی کا پُل، نظارے۔ میں انتظار کروں گا۔ مینا بازار۔ نغمے کی موت۔ نئے غلام۔ نیوٹرز ورل۔ وزیر کی بلی۔ ویکسینیٹر۔ ہائیڈروجن بم کے بعد۔ ہل کیا سائے میں۔ ہم تو محبت کرے گا۔ ہم وحشی ہیں۔ ہوا کے بیٹے۔ ہوائی قلعے۔ یوکلپٹس کی شاخ......

تصانیف

افسانے:

آدھے گھنٹے کا خدا	۱۹۶۹ء	پنجابی پستک بھنڈار، دہلی
اجنتا سے آگے	۱۹۴۸	کتب پبلشرز، بمبئی

اُلٹا درخت	-	-
اُلجھی لڑکی کالے بال	۱۹۷۰ء	حیدرآباد (آندھرا پردیش)
ان داتا	۱۹۴۲ء	لاہور
ایک خوشبو اُڑی اُڑی سی	-	مکتبہ افکار، کراچی۔
ایک روپیہ ایک پھول	مارچ ۱۹۵۵ء	ایشیا پبلشرز، تیس ہزاری، دہلی
ایک گرجا ایک خندق	مارچ ۱۹۴۸ء	نیشنل انفارمیشن اینڈ پبلیکیشنز، بمبئی
پانی کا درخت	۱۹۶۸ء	نیا ادارہ۔ لاہور
پرانے خدا	دسمبر ۱۹۴۴	عبدالحق اکیڈمی حیدرآباد دکن
پھول کی تنہائی	-	-
تاش کا کھیل	-	رفعت پبلشرز، لاہور
تین غنڈے	۱۹۴۸	نیا ادارہ لاہور/انڈین بک کمپنی، دہلی
ٹوٹے ہوئے تارے	۱۹۴۳ء	انڈین بک کمپنی، لاہور
دادر پُل کے بچے	-	-
درد کی نہر	-	کراچی بک ڈپو، کراچی
دسواں پُل	اکتوبر ۱۹۶۴ء	ایشیا پبلشرز، تیس ہزاری، دہلی
دشتِ خیال	-	ممتاز اکیڈمی، لاہور
دل کسی کا دوست نہیں	-	ایشیا پبلشرز، تیس ہزاری، دہلی
دوسری برف باری کے بعد	-	خیام پبلشرز۔ لاہور
زندگی کے موڑ پر	۱۹۴۳ء	مکتبہ اُردو، لاہور
سپنوں کا قیدی	جولائی ۱۹۶۳ء	مکتبہ جامعہ، نئی دہلی
سپنوں کی راہ گزر میں	-	خیام پبلشرز، لاہور
سونے کا صندوقچہ	-	-
سمندر دُور ہے	دسمبر ۱۹۴۸ء	نوہند پبلشرز، نئی دہلی
شانو،	-	رضا پبلشرز۔ لاہور
شکست کے بعد	۱۹۵۱ء	انارکلی کتاب گھر، لاہور

طلسمِ خیال	۱۹۳۹	مکتبہ اُردو، لاہور
طوفان کی کلیاں		
کاک ٹیل	-	سنگم پبلشرز، لاہور،
کالا سورج	-	کراچی (پاکستان)
کالے کوس	-	-
کانچ کے ٹکڑے	-	-
کبوتر کے خط	-	پاشا پبلشرز، لاہور
کتاب کا کفن	جنوری ۱۹۵۶	بیسویں صدی، دہلی
کرشن چندر کے افسانے	۱۹۶۰ء	ایشیا پبلشرز، دہلی
کشمیر کی کہانیاں	۱۹۴۹ء	الہ آباد پبلشنگ ہاؤس، الہ آباد
کھڑکیاں	-	-
گلشن گلشن ڈھونڈا تجھ کو	۱۹۶۷ء	ایشیا پبلشرز، دہلی
گھونگھٹ میں گوری جلے	۱۹۵۳ء	ساقی بک ڈپو، دہلی
مٹی کے صنم		
مزاحیہ افسانے	مئی ۱۹۵۴ء	آزاد کتاب گھر، کلاں محل، دہلی
مسکرانے والیاں	۱۹۶۰ء	-
مس نینی تال	۱۹۶۴ء	پنجابی پستک بھنڈار
مینا بازار	۱۹۵۳ء	مکتبہ شاہراہ، جامع مسجد، دہلی
میں انتظار کروں گا	دسمبر ۱۹۵۳ء	مکتبہ شاہراہ، جامع مسجد دہلی
نظارے	جون ۱۹۴۰	کتب خانہ ادبی دنیا، لاہور
نغمے کی موت	مئی ۱۹۴۴ء	ہندوستان پبلشرز، دہلی
نئے افسانے	۱۹۴۳ء	دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی
نئے غلام	اپریل ۱۹۵۳ء	قادری کتب خانہ، بمبئی
ہائیڈروجن بم کے بعد	اپریل ۱۹۵۵ء	ایشیا پبلشرز، تیس ہزاری، دہلی
ہل کے سائے میں	۱۹۴۹ء	مکتبہ سلطانی، بمبئی

ہم تو محبت کرے گا	ـ	ایشین بک سینٹر کراچی
ہم وحشی ہیں	ستمبر ۱۹۴۹ء	کتب پبلشرز بمبئی
ہوائی قلعے (مزاحیہ)	ستمبر ۱۹۴۰ء	اُردو بک اسٹال، لاہور
یوکلپٹس کی ڈالی	مارچ ۱۹۵۵ء	ایشیا پبلشرز، تمیس ہزاری دہلی

ناول:

آدھا راستہ	۱۹۷۷ء	نصرت پبلشرز، لکھنؤ
آدھے سفر کی پوری کہانی (ہندی)	۱۹۸۲	راجپال اینڈ سنز، دہلی
آسمان روشن ہے	۱۹۵۷ء	ایشیا پبلشرز، دہلی
آئینے اکیلے ہیں	۱۹۷۲ء	نصرت پبلشرز، لکھنؤ
اُس کا بدن میرا چمن	۱۹۷۴ء	نکہت پاکٹ بکس، الہٰ آباد
ایک گدھا نیفا میں	۱۹۶۴ء	ـ
ایک گدھے کی سرگزشت	۱۹۵۷ء	شمع بک ڈپو، دہلی۔
ایک عورت ہزار دیوانے	۱۹۵۷	بیسویں صدی دہلی / مکتبہ افکار، کراچی
ایک کروڑ کی بوتل	۱۹۷۱ء	پنجابی پستک بھنڈار، دہلی
ایک وائلن سمندر کے کنارے	۱۹۶۳ء	ایشیا پبلشرز دہلی / مکتبہ افکار کراچی
باون پتے	۱۹۵۷ء	شمع بک ڈپو، نئی دہلی
برف کے پھول	۱۹۶۱ء	رومانی دنیا الہٰ آباد، (اُتر پردیش)
بمبئی کی شام	ـ	کسم پرکاشن، الہٰ آباد
بور بن کلب	۱۹۶۲ء	مشورہ بک ڈپو، دہلی
پانچ لوفر	۱۹۶۶ء	پنجابی پستک بھنڈار دہلی
پانچ لوفر ایک ہیروئن	۱۹۶۶	پنجابی پستک بھنڈار دہلی / کراچی بک ڈپو، کراچی
پہلا پتھر	ـ	ـ
پیار ایک خوشبو (ماخوذ)	۱۹۷۱ء	ماہنامہ شاعر بمبئی (ناولٹ نمبر)
تاش کا کھیل (بچوں کے لیے ناول)۔		ـ
جب کھیت جاگے	۱۹۵۲ء	بمبئی بک ہاؤس، بمبئی

جنت اور جہنم	-	جاوید پبلی کیشنز، لاہور
چاندی کے گھاؤ	۱۹۶۴ء	پنجابی پستک بھنڈار، دہلی
چنبل کی چنبیلی	۱۹۷۳ء	ایشیا پبلشرز، دہلی
چندا کی چاندنی	۱۹۷۱ء	کسم پرکاشن، الہ آباد
دادر پُل کے بچے	۱۹۶۱ء	ایشیا پبلشرز، دہلی
درد کی نہر	۱۹۶۳ء	ایشیا پبلشرز، دہلی
دل کی وادیاں سو گئیں	۱۹۵۶ء	بیسویں صدی، دہلی
دوسری برف باری سے پہلے	۱۹۶۷ء	ماہنامہ شاعر بمبئی، کرشن چندر نمبر
زرگاؤں کی رانی	۱۹۶۶ء	شمع بک ڈپو، نئی دہلی/اُردو پاکٹ بکس، کراچی
سپنوں کی رہگذر میں	-	ماہنامہ بیسویں صدی دہلی (قسط وار)
سپنوں کی وادی	۱۹۷۷ء	ایشیا پبلشرز، دہلی
سڑک واپس جاتی ہے	۱۹۶۱ء	ایشیا پبلشرز دہلی/مکتبہ افکار، کراچی۔
سونے کا سنسار	۱۹۷۶ء	نکہت پاکٹ بکس، الہ آباد
شکست	جنوری ۱۹۴۳ء	ساقی بک ڈپو، دہلی۔
صبح ہوتی ہے	-	-
طوفان کی کلیاں	۱۹۵۴ء	مکتبہ شاہراہ، دہلی
غدار	۱۹۶۰ء	نیا ادارہ، دہلی/نیا ادارہ لاہور
فُٹ پاتھ کے فرشتے	۱۹۷۷ء	ماہنامہ بیسویں صدی، دہلی (قسط وار)
فلمی قاعدہ (طنزیہ)	۱۹۶۶ء	پنجابی پستک بھنڈار، دہلی
کارنیوال	-	اہلووالیہ بک ڈپو، نئی دہلی/نسیم بک ڈپو، لاہور
کاغذ کی ناؤ	-	اہلووالیہ بک ڈپو، نئی دہلی/کراچی، بک ڈپو، کراچی
گدھے کی واپسی	۱۹۶۲ء	ایشیا پبلشرز دہلی
گنگا بہے نہ رات	۱۹۶۶ء	نفیس پبلی کیشنز، الہ آباد
گوالیار کا حجام	۱۹۶۹ء	کسم پرکاشن الہ آباد
لندن کے سات رنگ		اسٹار پبلی کیشنز/اعوان پبلی کیشنز، لاہور

مٹی کے صنم (سوانحی ناول)	۱۹۶۶ء	ایشیا پبلشرز، دہلی
مالا رانی	-	
محبت بھی قیامت بھی	۱۹۷۴	نکہت پاکٹ بکس، الہ آباد
محبت کی رات	-	-
مسکرانے والیاں	-	-
مشینوں کا شہر	۱۹۷۱ء	نصرت پبلشرز، لکھنؤ
مہارانی	۱۹۷۱ء	پنجابی پستک بھنڈار، دہلی
میری یادوں کے چنار (سوانحی ناول)	۱۹۶۲ء	ایشیا پبلشرز دہلی/ادارہ فروغ اُردو، لاہور
ہانگ کانگ کی حسینہ	۱۹۶۷ء	نفیس پبلی کیشنز، الہ آباد/اُردو پاکٹ بکس، کراچی
ہونولولو کا راجکمار	-	اہلووالیہ بک ڈپو، نئی دہلی

رپورتاژ

پودے	۱۹۴۷	مکتبہ سلطانی، بمبئی
صبح ہوتی ہے	۱۹۵۰ء	مکتبہ سلطانی، بمبئی

ڈرامے

دروازہ	-	اُردو اکیڈمی، لاہور
دروازے کھول دو	-	مکتبہ جامعہ، نئی دہلی۔
سرائے کے باہر	-	-

درج ذیل ڈرامے مجموعوں میں شامل ہیں

منگلیک	-	
نظارے		
بدصورت راجکماری		

طنز و مزاح

ایک گدھے کی سرگزشت		
ٹھونگے (مزاحیہ مضامین)	۱۹۴۳ء	دفتر کتابت، جودھپور
دیوتا اور کسان	-	ایشیا پبلشرز، دہلی

شکست کے بعد	ستمبر ۱۹۵۱ء ایشیا پبلشرز، دہلی
فلمی قاعدہ	- -
ہوائی قلعے	ستمبر ۱۹۴۰ء اُردو بک اسٹال، لاہور

متفرق

سعادت حسن منٹو (سوانحی خاکہ۔ کتابچہ) -

نئے زاویے (انتخاب پہلی جلد) اگست ۱۹۴۰ء مکتبہ اُردو، لاہور

کرشن چندر کی کتابیں

کرشن چندر کی ترقی پسندی از سید شفیق احمد شیروانی ۱۹۸۶ء

کرشن چندر کے بہترین افسانے مرتبہ اختر جعفری چودھری اکیڈمی لاہور

کرشن چندر کے افسانوی ادب میں حقیقت نگاری ۱۹۹۱ء -

کرشن چندر اور اُن کے افسانے، اطہر پرویز، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ

کرشن چندر (ہندوستانی ادب کے معمار)، جیلانی بانو ۱۹۸۶ء، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی

کرشن چندر کے ناولوں میں ترقی پسندی، حیات افتخار، نسیم بک ڈپو لکھنؤ

کرشن چندر کے بہترین افسانے، ریوتی سرن شرما / اُپیندر ناتھ، ۲۰۰۴ء ایشیا پبلشرز، دہلی

کرشن چندر کی افسانہ نگاری شفیق اعظمی، نصرت پبلشرز، لکھنؤ

اُردو کتھا کار کرشن چندر (ہندی) ہند کشور وکرم، اندر پرستھ پرکاشن، کرشن نگر، دہلی

کرشن چندر نمبر:

ادب نکھار کرشن چندر نمبر مئو ناتھ بھنجن۔ اگست ستمبر ۱۹۷۷ء

اُردو بک ڈائجسٹ (۶)، لاہور، مرتبہ طاہر ستار، ۱۹۸۰ء

ماہنامہ افکار کراچی	صہبا لکھنوی	مئی ۱۹۷۷ء
ماہنامہ بیسویں صدی، نئی دہلی	خوشتر گرامی	مئی ۱۹۷۷ء
ماہنامہ تعمیر ہریانہ چنڈی گڑھ	ایم ایل بھاٹیہ رسکھد یوراج شرما	

مئی۔ جون ۱۹۷۷ء

ماہنامہ شاعر بمبئی کرشن چندر (۱)، اعجاز صدیقی، ۱۹۶۷ء

ماہنامہ شاعر بمبئی کرشن چندر نمبر (۲) اعجاز صدیقی، ۱۹۷۷ء

نیرنگ اُردو ڈائجسٹ دہلی کرشن چندر کہانی نمبر اظہر حسین راہی، جلد ۴ شمارہ ۲
ان کے علاوہ کرشن چندر کی دوسری برسی پر ۸ر مارچ کو ۱۹۷۹ء کو کرشن چندر میموریل سوسائٹی، اُردو اکیڈمی قیصر باغ لکھنؤ، نے ایک سووینیر اور... ۱۱ر جنوری کو ڈاکٹر رفیق ذکریا چیئر مین جشن کرشن چندر کمیٹی نے ایک سووینیر پیش کیا۔علاوہ ازیں ماہنامہ آج کل نئی دہلی مارچ ۱۹۹۱ء، ماہنامہ افکار بھوپال (خاص نمبر)۹ ۱۹۴۹۔ اور افکار کراچی اکتوبر ۱۹۶۲ء، دو ماہی الفاظ علی گڑھ نومبر دسمبر ۱۹۸۰ء، ماہنامہ بیسویں صدی دہلی افسانہ نمبر جولائی ۱۹۶۴ء اور جولائی ۱۹۷۷ء، ماہنامہ جواز مالیگاؤں مئی ۱۹۶۷ء، خبر نامہ اُتر پردیش اُردو اکادمی لکھنؤ جون ۱۹۸۷ء، ماہنامہ شاعر بمبئی اقبال نمبر ۱۹۸۸ء، عصری آگہی دہلی (راجندر سنگھ بیدی نمبر) اگست ۱۹۸۲ء فن اور شخصیت بمبئی آپ بیتی نمبر ستمبر
۱۹۷۸ء ،ماہنامہ ''نقوش'' لاہور، شخصیات نمبر، اور منٹو نمبر ...وغیرہ میں بھی کرشن چندر پر مضامین ہیں۔

وفات: ۸ر مارچ ۱۹۷۷ء کو ساڑھے چار بجے صبح بمبئی میں رحلت۔

اعزازات: نومبر ۱۹۶۶ء میں حکومتِ سوویت روس کی جانب سے سوویت نہرو ایوارڈ اس اعزاز میں پندرہ دن کی روس یاترا بھی شامل تھی۔
۱۹۶۹ء میں حکومتِ ہند کی جانب سے اُن کی خدمات پر پدم بھوشن
نومبر ۱۹۷۳ء میں نہرو کلچرل ایسوسی ایشن بمبئی کا ایوارڈ۔
اُن کی وفات کے بعد پونچھ فاؤنٹن پارک کا نام بدل کر اُن کی یاد میں '' کرشن چندر پارک'' رکھا گیا اور بمبئی میں باندرا روڈ کا نام کرشن چندر روڈ کر دیا گیا۔

◆◆◆

Rs. 50/-